MUSSADAS-E-HALI
KA
SAMAJIATI MUTALA

Dissertation submitted to the Jawaharlal Nehru University
in partial fulfilment of the requirements
for the award of the Degree

MASTER OF PHILOSOPHY

Pervez Ahmad Khan

CENTRE FOR INDIAN LANGUAGES
SCHOOL OF LANGUAGE, LITERATURE AND CULTURE STUDIES
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
NEW DELHI-110067
INDIA
2000

مسدس حالی کا سماجیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم فل

نگراں

ڈاکٹر انور پاشا

مقالہ نگار

پرویز احمد خاں

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

اسکول آف لینگویجز، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۶۷

۲۰۰۰ء

जवाहरलाल नेहरू विश्वविद्यालय
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
School of Language, Literature, & Culture Studies
NEW DELHI-110067. INDIA

Centre of Indian Languages

5.1.2000

DECLARATION

I declare that the material in this entitled "MUSSADAS-E-HALI KA SAMAJIATI MUTALA" submitted by me is original research work and has not been previously submitted for any other Degree of this or any other university.

(PERVEZ AHMAD KHAN)

5/1/2000

DR. ANWAR PASHA
SUPERVISOR
CIL/SLL & CS/JNU

PROF. NASEER AHMAD KHAN
CHAIRPERSON
CIL/SLL & CS/JNU

Date:

GRAM JAYENU. TEL (91 011) 6107676, 6167557 Extn 2217, Fax (91-011) 6165886, 6106025

عنوانات

	عناوین	صفحہ نمبر
۱.	پیش لفظ	۳
۲.	باب اول	
	حالیؔ شخصیت اور ان کی ادبی خدمات	۶
	حالی کی تصانیف	۱۲
	حالی اور ان کا عہد	۱۷
	حالی کے عہد کا عالمی مسلم معاشرہ	۲۹
۳.	باب دوم	
	حالی کا تاریخی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی شعور	۳۸
۴.	باب سوم	
	مسدس حالی کا سماجیاتی تجزیہ	۶۶
	حالی کا فکری اور نظریاتی رویہ (بحوالہ مسدس)	۸۹
	مسدس حالی کا فنی پہلو	۹۷
۵.	کتابیات	۱۰۹

پیش لفظ

اگر دیوانِ غالب کو عبد الرحمٰن بجنوری "الہامی" کتاب تصور کرتے ہیں تو رام بابو سکسینہ بھی مسدس حالی کو "الہامی" کتاب گردانتے ہیں۔ مسدس حالی کو نہ صرف الہامی کتاب تصور کیا گیا بلکہ سر سید احمد نے تو اسے توشہ آخرت کہا اور اعمال حسنہ سے تعبیر کیا۔

یہ سچ ہے کہ یہ نظم سر سید احمد کے ایماء پر لکھی گئی ہے اور اس میں علی گڑھ تحریک کے مقاصد کو پیش کرنے کی شعوری کوشش بھی ملتی ہے لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ حالی کی شخصیت اور ان کی شاعری ایک مخصوص انفرادیت کی بھی حامل ہیں، اس لیے اس کو سر سید کے تمام خیالات کی بازگشت یا پرتو نہیں کہہ سکتے۔ جب حالی اسلامی تاریخ کے عروج وزوال کا بیان کرتے ہیں تو اس میں اپنے ذاتی مطالعہ کو پیش کرتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب وہ ترقی کی راہ کا تعین کرتے ہیں تو وہاں سر سید کی تقلید کرتے ہیں اور سر سید کے نظریے کے حامی نظر آتے ہیں۔

حالی کی شخصیت بہت ہی پر اثر اور دلکش تھی۔ وہ سنجیدہ اور خاموش مزاج تھے۔ ان میں ہمدردی، انکساری اور انسان دوستی بدرجہ اتم موجود تھی، دل آزاری کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ قوم کے سچے ہمدرد اور عظیم مصلح تھے۔ وہ بڑے جذبۂ اخلاص وایثار کے ساتھ قوم کی خدمت کرتے رہے۔ حالی کی کوئی بھی تحریک افادیت سے خالی نہیں۔

مسدس حالی (مد و جزر اسلام) مایۂ ناز تصنیف ہے جو حالی کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے کافی ہے۔ حالی نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے بلکہ ایک اچھے نقاد بھی تھے۔ حالی کی شاعری میں جھوٹ اور مبالغہ سے مبرا ہے۔ وہ نہ جھوٹ بولنا پسند کرتے ہیں اور نہ ہی جھوٹی شاعری کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی ابتدائی شاعری میں بھی بیجا غلو اور جھوٹ سے احتراز ملتا ہے۔ انہوں نے پہلی بار شاعری کو سچ بولنا سکھایا۔ حالی اپنی شاعری میں عورتوں کو صرف خیالی محبوب نہیں بناتے بلکہ عورتوں کی ذات سے متعارف بھی کراتے ہیں۔ وہ عورتوں کو صرف معشوق ارضی نہیں گردانتے اس کو ماں، بہن، بہو اور بیٹی بھی بناتے ہیں۔ ان کی شاعری میں غضب کی روانی اور سادگی ہے۔ انہوں نے شاعری کے بہاؤ کو تو نہیں موڑا لیکن موضوع کی کشتی کا رخ بدل دیا۔

حالی کی شاعری اور تنقید پر تو بہت سی کتابیں اور مضامین دستیاب ہیں لیکن مسدس حالی پر تفصیلی اور تنقیدی مضامین یا تو کم یاب ہیں یا نایاب۔ ابھی تک میری نگاہ میں مسدس حالی پر اس طرح کی کوئی کتاب نہیں گزری جو مسدس حالی کے ہر پہلوؤں کی تفصیلی احاطہ کرتی ہو۔ مجھے امید ہے کہ یہ مقالہ اس خلاء کو پر کرنے کی جانب ایک مثبت قدم ثابت ہو گا۔

یہ مقالہ ''مسدس حالی کا سماجیاتی مطالعہ'' تین ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں حالی کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات پر صراحت سے بحث ہوئی ہے۔ اس باب میں حالی کی پیدائش سے وفات تک کے اہم واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ باب دو ذیلی ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے ذیلی باب میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی زبوں حالی کے تناظر میں حالؔی کے نظریے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے ذیلی باب میں عالمی اسلامی معاشرے پر گفتگو کی گئی ہے۔ جس میں اسلامی تاریخ کے عروج و زوال کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں حالؔی کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور مذہبی شعور پر بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں حالی کے نظریات اور تصورات پر کہیں اشارتاً اور کہیں صراحتاً بحث کی گئی ہے۔ اورنگ زیب کی وفات سے بغاوت تک کے عرصے میں حالی کے خیالات میں آئے ارتقاء کو پیش کیا گیا ہے۔ آخری اور تیسرے باب میں مسدس کا سماجی تجزیہ ہے جس میں موجودہ حالات کی روشنی میں مسدس کی اہمیت اور معنویت کو پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور اسلامی تاریخ کی قابل فخر تابناکی کا بیان ہے جس میں حدوث زمانے کے مسلمانوں کی تاریخی، سیاسی اور مذہبی تشکیل نو کی فکر بھی نظر آتی ہے۔ اس کے دو ذیلی ابواب ہیں پہلے ذیلی باب میں حالی کا فکری اور نظریاتی رویے کو پیش کیا گیا ہے اور سر سید، نذیر احمد، حالی و شبلی کے اسلامی تصورات و تفکرات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور حالی کے اسلامی نظریے کو اجاگر کیا گیا ہے۔ دوسرے ذیلی باب میں مسدس کے فنی پہلوؤں پر گفتگو کی گئی ہے اور اس کے محاسن کو پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح تین ابواب کے ذریعہ مسدس حالی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مسدس کی مقبولیت سے کسی کو انکار نہیں۔ اس کی روانی اور تسلسل کی کارفرمائی اپنی جگہ مسلّم ہے۔ اس کے مطالعہ سے شاعرانہ مزاج پیدا نہیں ہوتا بلکہ ایک مخصوص فکر و نظر اور فہم و ادراک پیدا ہوتی ہے۔ حالی کا یہی کمال ہے کہ انہوں نے خیال اور بیان کو اس طرح شاعری کا جامہ پہنادیا ہے کہ مخصوص تاثیر پیدا ہو گیا جو قارئین پر خاص کیفیت طاری کرتا ہے۔ سہل و سادہ اور شستہ و رواں الفاظ کا استعمال ان کی خصوصیت ہے۔ جس سے ان کے بیان کے آگے سحر البیان بھی کچھ لمحہ خاموش ہو جاتا ہے اور اس کے غم سے انیس کا مرثیہ بھی اپنا غم چھپالیتا ہے اس کے حقائق سے تاریخ بھی اپنے دامن کو ڈھانپ لیتی ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ اس طرح پیوست ہے کہ وہیں پر وہ چیز موزوں معلوم ہوتی ہے۔ اس کی مثال شمس و قمر کی ہے، جس طرح شمس و قمر کے ضیاء سے ظلمات کے دھاگے ٹوٹتے ہیں اور جہاں روشن ہوتا ہے۔

اسی طرح حالی کا مسدس بمثل نورِ جہاں ہے کہ جب تک باقی رہے گا اس کے انوار سے جہاں منور ہوتا رہے گا اور افکار کی نئی کرن پھوٹتی رہے گی۔

اس مقالے کی تیاری میں اپنے استاد محترم ڈاکٹر انور پاشا صاحب کا میں بے حد مشکور و ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی تمام مصروفیات کے باوجود ہر وقت میری رہنمائی و نگرانی کرتے رہے جس کے بغیر مقالے کو بہتر طریقے سے پایۂ تکمیل کو پہنچانا نہایت مشکل امر تھا۔ میں اپنے تمام دوستوں بالخصوص اسلم پرویز، سروالہدیٰ اور آصف کا بھی حد درجہ شکر گذار ہوں کہ وہ مشکل مراحل میں میری ہمت افزائی کرتے رہے اور مقالے کی تیاری میں حسب ضرورت میری ہر نوع کی مدد کی۔ میں اپنے ہم وطن فخر عالم کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں جس نے مقالے کی تیاری میں اپنا قیمتی وقت دیا جس کے سبب مقالے کی تکمیل وقت پر ممکن ہو سکی۔ اس موقع پر میں اپنے والدین کی شفقتوں اور محبتوں کو فراموش نہیں کر سکتا جن کی ہمیشہ یہ دعا رہی کہ میں فرزند رشید ہوں اور ہر منزل پر کامیاب رہوں۔ میرے بھائی اور بہنوں (جاوید، فیروز، افروز، پروین اور یاسمین) کی نیک خواہشات ہمیشہ میرے ساتھ رہیں اور وہ سدا مجھے بلندیوں پر دیکھنے کے متمنی رہے۔ حالانکہ میں اپنے کوتاہی و نااہلی کی وجہ سے ان لوگوں کی امید پر کبھی پورا نہیں اتر سکا۔ میں اپنے سابق استاد محترم جناب ارشاد صاحب (پرنسپل بی آئی سی) کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے ہمیشہ میری رہنمائی کی اور کامیابی و کامرانی کی دعا بھی کرتے رہے۔

پرویز احمد خاں
۲۵۸، کاویری ہاسٹل
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

باب اول

حالی، شخصیت اور ان کی ادبی خدمات

پانی پت کی سرزمین جہاں تاریخی حیثیت سے اپنا مقام رکھتی ہے وہیں اس سرزمین کی ممتاز ہستیوں نے اپنی بے لوث خدمت سے اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ میر مہدی، مولانا الطاف حسین حالؔی، خواجہ غلام السبطین، خواجہ غلام الثقلین، خواجہ غلام السیدین، خواجہ احمد عباس، مولانا وحید الدین سلیمؔ، محمد اسمٰعیلؔ پانی پتی کے نام اردو زبان و ادب میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سب میں زیادہ اہم اور عظیم المرتبت ہستی مولانا حالؔی کی ہے۔

حالی کے آباواجداد افغانستان سے ہجرت کر کے آئے تھے، ان کا شجرہ نسب حضرت ایوب انصاریؓ سے ملتا ہے۔ حالی کے جد امجد کا نام خواجہ ملک علی تھا۔ جو تقریباً ۱۲۷۲ء میں غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶-۸۷ء) کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے تھے۔ ان کی ذہانت اور قابلیت سے متاثر ہو کر بادشاہ نے انہیں جاگیریں عطا کیں خواجہ ملک علی نے ان جاگیروں کو قبول کر کے پانی پت میں سکونت اختیار کر لی۔ جیسا کہ حالؔی رقمطراز ہیں :

> ”ساتویں صدی ہجری اور تیرہویں صدی عیسوی میں جبکہ غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا۔ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے۔ ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوتے تھے۔“(۱)

خواجہ ایزد بخش اس خاندان کی ۱۵ ویں نسل سے نسبت رکھتے تھے۔ خواجہ ایزد بخش کے پاس دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ امداد حسین بھائیوں اور بہنوں میں سب سے بڑے تھے اور الطاف حسین سب سے چھوٹے۔

حالی کی پیدائش ۱۸۳۷ء مطابق ۱۲۵۳ھ میں ہوئی۔ (۲) اس زمانے کے دستور کے مطابق ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور انہوں نے حافظ ممتاز حسین کی نگرانی میں قرآن حفظ کیا۔ خوش الحان اتنے تھے کہ جب قرأت کرتے تو لوگ محو سماع ہوتے۔ بچپن سے ہی حالی سنجیدہ مزاج اور غم گسار طبع تھے۔ صبر و قناعت، ایثار و ہمدردی، مروت اور جود ان کے

اہم اوصاف ہیں۔ ابھی حالی کی عمر نو برس کی تھی کہ ان کے والد محترم دنیائے فانی سے دار البقاء کو رحلت فرما گئے۔ اس حادثے سے ان کی والدہ کا ذہنی توازن خراب ہو گیا۔ باپ کی شفقت سے محروم ہو کر انہوں نے بڑے بھائی کی آغوش رحمت میں پرورش پائی۔ بڑے بھائی نے ان کی پرورش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، حالی کو خوش رکھنے کی ہر ممکنہ کوشش کی لیکن والدہ کے مالیخولیا میں مبتلا ہونے کا غم حالی کو ہمیشہ رہا۔ ان کی بہنیں اس غم کو دور کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ لیکن دل کا داغ ایسا تھا کہ مٹائے نہ مٹ سکا۔ جب حالی سن بلوغ کو پہونچے تو ان کی شادی ان کی ماموں زاد بہن اسلام النساء سے کر دی گئی۔

"..... مگر چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر ے ابرس کی تھی۔"(۳)

حالی کو یہ شادی ناپسند تھی کیونکہ وہ شادی کو تعلیم کے لیے رکاوٹ سمجھ رہے تھے۔ وہ علم کے دلدادہ اور شیدائی تھے اور شادی ان کے لیے رخنہ تھا لیکن بڑے بھائی اور گھر والوں کی فرمائش حرفِ آخر تھی۔ ان کا بیان ہے :

"زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گذارہ تھا کہ جو میرے کندھے پر رکھا گیا اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے۔"(۴)

لیکن شادی کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ خوش قسمتی کہئے کہ ان کے ماموں (میر باقر علی) خوش حال تھے اور اپنی بیٹی کی پوری ذمہ داری کو خود پورا کرتے تھے اور حالی اس سے آزاد تھے۔ لہذا وقت کو غنیمت جانا اور دہلی روانہ (۱۸۵۴ء) ہو گئے۔ "سب کی خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں۔ مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال تھا۔ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا۔"(۵)

دہلی کا یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹمار ہا تھا، بہادر شاہ کی حکومت برائے نام رہ گئی تھی۔ سلطنت کی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ میں تھی اور بہادر شاہ ظل حمایت تھے۔ باوجود اس انتشار و بحران کے اس دور میں بھی دہلی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھی۔ ممتاز ہستیاں اور مشہور شاعر اور عالم دین عزت کی زندگی گذار رہے تھے۔ اسی زمانے میں خواجہ دہلی تشریف لائے۔ جب دہلی پہنچے تو ان کی کسی سے جان پہچان تھی اور نہ کوئی رشتہ داری۔ جامع مسجد کے قریب ایک مدرسہ تھا "حسین بخش کا مدرسہ"۔ اس مدرسہ کے صدر نوازش علی تھے جو اپنے علم و تقوی کے لیے معروف تھے۔ اس مدرسے میں حالی نے داخلہ لے لیا۔(۶) یہاں کے ممتاز اساتذہ مولوی فیض الحسن، مولوی امیر احمد اور شمس العمار ہیں۔ میاں نذیر حسین سے بھی تعلیم حاصل کی۔ دہلی میں حالی کا قیام تقریباً ایک سال رہا۔ ۱۸۵۵ء میں ان کے گھر

والوں کو اس کا علم ہوا تو ان کے بڑے بھائی منت وسماجت کر کے حالی کو گھر واپس لے گئے۔

دورانِ قیام پانی پت حالی نے ادھوری تعلیم کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ پانی پت سے قریب ہی حصار کے دفتر کلکٹری میں معمولی سی تنخواہ پر ملازمت کر لی۔ یہ نوکری گذر اوقات کیلئے کافی تھی۔ لیکن بہ مشکل ایک سال ہوا ہو گا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی رونما ہوئی۔ دہلی اس وقت لوٹ مار کی جگہ بن گئی تھی اور حکومت برطانیہ ہندوستانی معیشت کو تباہ وبرباد کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ جنگ کا اثر رفتہ رفتہ قرب وجوار کے علاقوں پر بھی پڑ رہا تھا اور ہر آدمی خود کو غیر محفوظ محسوس کر رہا تھا اور جائے پناہ کی تلاش میں تھا۔ حالی بھی گھبرا کر گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔ لیکن حالی پانی پت میں بھی سکون کی زندگی بسر نہیں کر پائے، گھر کی ذمہ داری ان کو ہر وقت پریشان کر رہی تھی۔ بالآخر حالی نے دوبارہ دہلی آنے کا قصد کیا اور ۱۸۶۲ء میں دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ ۱۸۶۳ء میں ان کی ملاقات نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ہوئی۔ شیفتہ کا تسلط ادبی حلقوں میں بہت تھا یہ اپنے چھوٹے بیٹے کی اتالیقی کے لیے بہت فکر مند تھے۔ حالی کی ملاقات سے شیفتہ بہت متاثر ہوئے اور ان کو جہاں گیر آباد میں اتالیقی کے لیے بلا لیا۔ حالی یہاں سات سال تک مقیم رہے اور شیفتہ سے بھی مستفید ہوتے رہے۔ حالی نے شیفتہ کی صحبت میں رہ کر اپنی شعر وسخن کو جلا بخشی اور اپنا تخلص "خستہ" سے حالی رکھا۔ (۷)

اس زمانہ قیام میں حالی کی ملاقات غالب سے ہوئی جن کی شخصیت اور سخن دانی سے حالی بہت متاثر ہوئے۔ فروری ۱۸۶۹ء میں غالب کی وفات ہو گئی۔ چند مہینے بعد شیفتہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ حالی ایک بار پھر بے یار ومددگار ہو گئے اور ان کو فکر معاش پریشان کرنے لگی کہ اسی اثناء میں پنجاب گورنمنٹ ڈپو لاہور میں ایک مترجم کی جگہ خالی ہوئی۔ حالی نے درخواست دی اور ملازمت کر لی۔ یہاں حالی کو مغربی خیالات سے واقفیت حاصل کرنے کا اچھا موقع ملا۔ انہوں نے بہت سی مغربی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ مغربی نظریات سے بہت متاثر ہوئے اور اس کو اردو میں پیش کرنے لگے۔

۱۸۷۴ء میں پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر جنرل سر ڈونلڈ میکلوڈ نے کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر تعلیمات کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں اردو شاعری کو دیگر مضامین کی طرح شامل کیا جائے۔

> "یہ بہت اہم اقدام ہے اور اس کے لیے کوشش کرنا چاہئے کہ پرانی شاعری کے بجائے نئی شاعری آج کے حالات کے تحت آہستہ آہستہ استعمال میں لائی جائے۔" (۸)

ہالرائیڈ کا قیمتی مشورہ اردو شاعری کی تعلیمی حیثیت کو اجاگر کرنے میں بڑا کار آمد ثابت ہوا اور اسی سلسلے میں انجمن پنجاب کی ایک میٹنگ ۹ رمئی ۱۸۷۴ء کو لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس جلسے میں محمد حسین آزاد پیش پیش تھے اور ان ہی کی نگرانی میں جلسہ منعقد ہوا تھا۔

کرنل ہالرائیڈ کی ایما پر جن مشاعرے کا انعقاد ہوا تھا اس کی خوبی تھی کہ اس میں یہ شرط رکھی گئی تھی کہ غزل کے بجائے نظم پڑھی جائے اور طرح کے بجائے عنوان دیا جائے۔ اس مشاعرے میں حالی نے کئی نظمیں پیش کیں۔ برکھارُت، نشاطِ امید، مناظرہ رحم وانصاف وغیرہ انہی مشاعرہ کی مرہون منت ہیں۔

حالی تقریباً چار سال لاہور میں رہے۔ لاہور میں ادبی فضا اچھی تھی پھر بھی حالی کا دل وہاں نہیں لگا وہ دہلی کی جدائی کو برداشت نہیں کر سکے اور آخر کار دوبارہ دہلی واپس آگئے۔ یہاں اینگلو عربک اسکول میں مدرس کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔ بڑی محنت و کوشش سے طالب علموں کو پڑھایا لیکن ان کا دل ہمیشہ قوم کی فکر کو لے کر مضطرب رہا۔ وہ فطرتاً ایک مصلح تھے اور ہر میدان میں اصلاح چاہتے تھے اس لیے سرسید احمد خاں (۱) کی پیروی کو پسند کیا اور ان سے ملاقات ان کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئی۔ بقول صالحہ عابد حسین :

> ''حالی کی سرسید سے ملاقات ہوئی تو وہ ان کی زبردست شخصیت ان کی مضبوط سیرت اور سب سے زیادہ ان کے بلند مقصد سے بے حد متاثر ہوئے اور دل و جان سے سرسید کے ساتھ ہو گئے اور اپنی باقی ۳۸ سالہ زندگی کی ہر سانس کو اس مقصد کے لیے وقف کر دیا کہ اپنی خواب غفلت میں سرشار قوم کو جگانا اور اسے ترقی کے راستے پر چلنا سکھانا ہے۔''(۹)

حالی اب گل و بلبل، عشق و معشوق، شمع و پروانہ کی شاعری سے اکتا گئے تھے۔ ان کو احساس ہو چکا تھا کہ ایسی شاعری سے قوم کی خدمت انجام نہیں دی جا سکتی ہے اس لیے زندگی کے ان حقائق کو شاعری میں پیش کرنے کی تلقین کی جس سے ہر کس و ناکس دوچار ہوتا ہے۔ غرض کہ شاعری کی افادی پہلو پر زور دینا ان کا اہم مقصد بن گیا جو سرسید کا منشا تھا۔

وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :

> ''زمانے کا نیا ٹھاٹ دیکھ کر پرانی شاعری سے سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی..... قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے۔''(۱۰)

سرسید کی تحریک نے حالی پر جادو کا اثر کیا اور حالی اس تحریک کے ایک اہم رکن بن گئے اور تاحیات اس کی خدمت کرتے رہے بلکہ دل و دماغ کی بہترین قوتوں سے کام لے کر انہوں نے مشہور و معروف مسدس انہی کے ایما پر لکھی جس کو ''مدوجزر اسلام'' کہتے ہیں اور جس کے بارے میں سرسید کا قول ہے کہ ''جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا ہے تو کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔''

---

(۱) اس وقت سرسید اصلاحی تحریک چلا رہے تھے۔ جس کو علی گڑھ تحریک سے منسوب کرتے ہیں۔

حالی اس عرصے میں کافی کتابیں لکھ چکے تھے۔ ان کی ادبی اور علمی خدمات کی بنا پر ۱۹۰۴ء میں حکومت برطانیہ کی طرف سے انہیں سب سے بڑے ادبی خطاب شمس العلماء سے نوازا گیا۔ حالی اعزاز و اکرام کے خواہش مند نہ تھے۔ لیکن اس اعزاز کے دیئے جانے پر بہت خوش تھے۔ تمام علمی اور ادبی حلقوں میں خوشیاں منائی گئی۔ اور مبارک بادی کے سینکڑوں خطوط آئے۔ ان میں مولانا شبلی کا خط بہت مختصر لیکن جامع ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

"مولانا آپ کو تو نہیں لیکن خطاب شمس العلماء کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اب جا کر اس خطاب کو عزت حاصل ہوئی۔" (۱۱)

حالی طبیعت کے بڑے نیک تھے اور مزاج میں سنجیدہ۔ ان میں نام و نمود، شہرت و ثروت کی بو پاس تک نہیں تھی۔ دسمبر ۱۹۰۵ء میں میر محبوب علی خاں حیدر آباد نے چہل رسالہ کے سال گرہ کے موقع پر حالی کو مدعو کیا۔ اِس کے باوجود کہ حالی کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی حیدر آباد کے سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ (کیونکہ خاصے دنوں تک حیدر آباد سے وظیفہ پا رہے تھے) اور جون ۱۹۰۶ء تک حیدر آباد ہی میں مقیم رہے۔ اس مدت میں ان کے اعزاز و اکرام میں مختلف جلسے اور تقریبات ہوئیں۔ جب حالی وہاں سے واپس آنے لگے تو اہل حیدر آباد نے دلی عقیدت اور محبت کا اظہار کرتے ہوئے ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ جس کے چند سطور یہ ہیں :

"اہل حیدر آباد کے لیے یہ کچھ کم باعث فخر و عزت نہیں کہ آپ جیسا فاضل، صاحب دل اور ہمدرد بنی نوع انساں اس شہر میں آئے چند روز قیام کرے اور لوگوں کو اپنی صحبت سے مستفیض کرے۔ آپ کے احسانات ہمارے ملک اور قوم پر ایسے نہیں کہ وہ ہمارے شکریہ کا محتاج ہوں، بلکہ وہ ہم پر ایسے چھائے ہوئے ہیں کہ ان کے شکریہ سے عہدہ برآ ہونا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ سرسید کے مشن کو آپ سے زیادہ کسی سے مدد نہیں ملی۔ آپ زیادہ تر ہمارے شکریہ کے اس لیے بھی مستحق ہیں کہ جب سے آپ نے قلم اٹھایا کوئی بھی تصنیف اپنی ذاتی منفعت کے لیے نہیں کی محض ملک کی بہبودی اور فلاح کے لیے..... اس سے بھی بڑھ کر بات ہے کہ آپ نے ہمیشہ ایسے مضمون پر قلم اٹھایا جس کا اثر، فائدہ اور دلچسپی لازوال ہے۔ "مجالس النساء" سے لے کر "حیاتِ جاوید" تک اور "مسدس حالی" سے لے کر "چپ کی داد" تک آپ کی کل تصانیف حبِ وطن اور فلاح قوم سے بھری ہوئی ہیں۔" (۱۲)

دسمبر ۱۹۰۷ء میں کراچی میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا۔ اس جلسے کی صدارت مولانا کو سونپی گئی۔ حالی طبعتاً منکسر اور سادگی پسند واقع ہوئے تھے۔ دل آزاری ان کے یہاں کبیرہ گناہ تھا۔ اس لیے ۲۱/ دسمبر ۱۹۰۷ء

حالی اس عرصے میں کافی کتابیں لکھ چکے تھے۔ ان کی ادبی اور علمی خدمات کی بنا پر ۱۹۰۴ء میں حکومت برطانیہ کی طرف سے انہیں سب سے بڑے ادبی خطاب شمس العلماء سے نوازا گیا۔ حالی اعزاز و اکرام کے خواہش مند نہ تھے۔ لیکن اس اعزاز کے دیئے جانے پر بہت خوش تھے۔ تمام علمی اور ادبی حلقوں میں خوشیاں منائی گئی۔ اور مبارک بادی کے سینکڑوں خطوط آئے۔ ان میں مولانا شبلی کا خط بہت مختصر لیکن جامع ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

"مولانا آپ کو تو نہیں لیکن خطاب شمس العلماء کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اب جا کر اس خطاب کو عزت حاصل ہوئی۔"(۱۱)

حالی طبیعت کے بڑے نیک تھے اور مزاج میں سنجیدہ۔ ان میں نام و نمود، شہرت و ثروت کی بو پاس تک نہیں تھی۔ دسمبر ۱۹۰۵ء میں میر محبوب علی خاں حیدرآباد نے چہل رسالہ کے سال گرہ کے موقع پر حالی کو مدعو کیا۔ باوجود اس کے کہ حالی کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی حیدرآباد کے سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ (کیونکہ خاصے دنوں تک حیدرآباد سے وظیفہ پا رہے تھے) اور جون ۱۹۰۶ء تک حیدرآباد ہی میں مقیم رہے۔ اس مدت میں ان کے اعزاز و اکرام میں مختلف جلسے اور تقریبات ہوئیں۔ جب حالی وہاں سے واپس آنے لگے تو اہل حیدرآباد نے دلی عقیدت اور محبت کا اظہار کرتے ہوئے ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ جس کے چند سطور یہ ہیں :

"اہل حیدرآباد کے لیے یہ کچھ کم باعث فخر و عزت نہیں کہ آپ جیسا فاضل، صاحب دل اور ہمدرد بنیٔ نوع انساں اس شہر میں آئے چند روز قیام کرے اور لوگوں کو اپنی صحبت سے مستفیض کرے۔ آپ کے احسانات ہمارے ملک اور قوم پر ایسے نہیں کہ وہ ہمارے شکریہ کا محتاج ہوں، بلکہ وہ ہم پر ایسے چھائے ہوئے ہیں کہ ان کے شکریہ سے عہدہ برآ ہونا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ سرسید کے مشن کو آپ سے زیادہ کسی سے مدد نہیں ملی۔ آپ زیادہ تر ہمارے شکریہ کے اس لیے بھی مستحق ہیں کہ جب سے آپ نے قلم اٹھایا کوئی بھی تصنیف اپنی ذاتی منفعت کے لیے نہیں کی محض ملک کی بہبودی اور فلاح کے لیے..... اس سے بھی بڑھ کر بات ہے کہ آپ نے ہمیشہ ایسے مضمون پر قلم اٹھایا جس کا اثر، فائدہ اور دلچسپی لازوال ہے۔ "مجالس النساء" سے لے کر "حیاتِ جاوید" تک اور "مسدس حالی" سے لے کر "چپ کی داد" تک آپ کی کل تصانیف حبِ وطن اور فلاح قوم سے بھری ہوئی ہیں۔"(۱۲)

دسمبر ۱۹۰۷ء میں کراچی میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا۔ اس جلسے کی صدارت مولانا کو سونپی گئی۔ حالی طبعتاً منکسر اور سادگی پسند واقع ہوئے تھے۔ دل آزاری ان کے یہاں کبیرہ گناہ تھا۔ اس لیے ۲۱/ دسمبر ۱۹۰۷ء

مع اپنے احباب کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھیوں میں خاص طور پر غلام الثقلین، خواجہ غلام السبطین، نواب وقار الملک اور منیجر سید حسین شریک تھے۔

حصار سے واپسی کے بعد سے ہی حالی کی طبیعت خراب ہونے لگی تھی اور ان کے اعضاء کبھی کبھی جواب دے جاتے تھے۔ حیدر آباد سے جب واپس آئے تھے تو ان کی داہنی آنکھ میں پانی اتر آیا تھا۔(۱۳) ۱۹۱۱ء میں جب مولوی عبد الحق صاحب نے انہیں اورنگ آباد آنے کے لیے اصرار کیا تو حالی کا جواب یہ تھا کہ "میری دلی خواہش ہے کہ چند روز وہاں آکر قیام کروں۔ مگر پیرانہ سالی میں اس قدر دور دراز کی مسافت پر کسی دوست کے یہاں جا کر رہنا یا تو اس کو تیمارداری کی تکلیف دینا ہے یا اس پر تجہیز و تکفین کا بار ڈالنا ہے۔(۱۴) رفتہ رفتہ حالی کی طبیعت خراب ہوتی گئی اور بالآخر دماغ نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ قویٰ کمزور ہو گیا، گویائی ضبط ہو گئی کہ بات تک نہیں کر سکتے تھے بلکہ جواب میں ہلکی سی مسکراہٹ اور اشارے ہوا کرتے تھے اور آخر کار علم و ادب کا پروردہ اور ہندوستانی ادب کا معمار ۳۱/ دسمبر ۱۹۱۴ء کو مالک حقیقی سے جا ملا۔

حالی کی تصانیف

حالی کی شخصیت اور خدمات کے بعد ذرا ان کی ادبی کوششوں و کاوشوں پر نظر ڈالی جائے۔ حالی اپنے مزاج و فن میں یکساں نظر آتے ہیں۔ راست گوئی اور دیانت داری ان کا شیوا ہے۔ جس طرح ان کی زندگی سادہ تھی لیکن پرکشش تھی اسی طرح ان کی نثر سادہ ہے لیکن دلچسپ ہے۔ انہوں نے سادہ سلیس اور عوامی زبان میں گفتگو کرنا پسند کیا۔ کیونکہ فطری زبان میں اثر زیادہ ہوتا ہے بلکہ دل کی بات دل کو لگتی ہے۔ اس لیے حالی نے وہی زبان اختیار کی جس سے اصلاح اور فلاح و بہبود کا کام آسانی سے ہو سکے۔ حالی کو زبان پر قدرت تھی وہ زبان کی نزاکت اور اس کی ظرافت و لطافت سے بخوبی واقف تھے۔ حالی خیال اور بیان میں بہترین ربط قائم رکھتے ہیں اور اس کا لحاظ اپنی پوری نثر میں کیا ہے۔ اس لیے جب وہ شاعری کے اصول مرتب کرتے ہیں تو زبان پر بھی خاص توجہ دیتے ہیں۔

حالی طالب علمی کے زمانے سے ہی تحریری کام میں دلچسپی رکھتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے (۵۵۔۱۸۵۴ء) میں انہوں نے وہابی مسلک کی حمایت میں ایک کتابچہ لکھا تھا جس کو اپنے استاد مولوی نوازش علی کو دکھایا تھا تو انہوں نے غصہ میں کتاب کو پھاڑ دی۔(۱۵) ''مجالس النساء'' حالی کی پہلی غیر مذہبی تصنیف ہے جو ۱۸۷۴ء میں لاہور سے دو حصوں میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب نذیر احمد کے ناول ''مجالس النساء'' کا تتبع ہے۔(۱۶) حالی اس ناول سے بہت متاثر ہوئے اور اسی طرز پر عورتوں کی اصلاح کی غرض سے قصے کے پیرائے میں آسان اور پرلطیف زبان میں ایک کتاب لکھی۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اس کتاب پر ۱۸۷۵ء میں کرنل ہالرائیڈ کی سفارش پر چار سو روپے کا نقد انعام ملا تھا۔

حالی کی اہم تصانیف میں ''مقدمہ دیوان حالی'' ہے جو ۱۸۹۳ء میں منظر عام پر آیا۔ اس دیوان کے ساتھ ایک طویل اور مدلل مقدمہ بھی شائع ہوا تھا۔ جس کو بعد میں دیوان سے الگ کر کے ''مقدمہ شعر و شاعری'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ اس مقدمہ کو جدید تنقید کا آغاز مانا جاتا ہے۔ حالی نے اس مقدمہ میں اردو شاعری کے افادی پہلو پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ بقول ڈاکٹر عابد حسین :

> یہ مقدمہ ان کے حسن ذوق اور وسعت نظر اور جدت خیال کا آئینہ ہے۔ جب کوئی غیر شاعر شعر کی تنقید پر نظر اٹھاتا ہے تو عموماً منطقی بحثوں میں پڑ کر اصل حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ مگر حالی خود

شاعر ہیں اس لیے انہوں نے اصولی مسائل کے ساتھ فن کی باریکیوں کو خوب سمجھا اور سمجھایا ہے۔
اردو میں حالی سے پہلے شعر کی تنقید کے معنی صرف یہ سمجھے جاتے تھے کہ لفظوں اور ترکیبوں کو اساتذہ
کے کلام کی کسوٹی پر دیکھ لیں۔ حالی ہی نے پہلے پہل یہ بحث چھیڑی کہ شاعری کی روح کیا ہے ؟اور
شعر میں کیسے پیدا ہوتی ہے ؟(۱۷)

اس مقدمہ میں حالی نے قدیم اور جدید نظریات کے ذریعہ ایک نئی عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے۔اس میں انہوں نے شاعری کے فن، خوبی اور خامی پر تفصیلی گفتگو کے ساتھ ساتھ غزل، قصیدہ اور مثنوی کی اصلاح کی طرف بھی توجہ دی ہے اور ساتھ ہی مختلف شعراء کے نمایاں کلام کو یاد کرنا ضروری قرار دیا ہے اور اس کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

حالی کی اہم سوانح عمری میں ”یادگار غالب“ اہم مقام رکھتی ہے۔ حالی نے غالب کی زندگی کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ لوگ لطف اندوز ہونے لگے اور ان کے کلام کے محاسن کو اس طرح پیش کیا ہے کہ لوگ غالب کی شاعری پر غور و فکر کرنے لگے۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ غالبؔ کو غالب بنانے میں حالی کا نمایاں رول ہے۔ حالی غالب کی شخصیت اور شاعری سے بہت متاثر تھے اور غالب سے ان کو ذاتی انسیت اور لگاؤ تھا۔ شیفتہ کی رفاقت میں وہ غالب کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ اس لیے حالی کو ان کی ذاتی زندگی سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ غالب کے انتقال پر حالی نے ایک پُر درد مرثیہ لکھا۔ جس میں غالب کے ان اوصاف و کمالات کا ذکر کیا ہے جس سے وہ مستفید ہوتے تھے۔ مرثیہ کے بعد حالی نے غالب کی سوانح عمری لکھی جو ۱۸۹۷ء میں ”یادگار غالب“ کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں غالب کی سیرت اور شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دوسرے حصے میں محاسنِ کلام پر۔ حالیؔ نے اس کتاب کی غرض و غایت کی طرف خود اشارہ کیا ہے۔

”تیرہویں صدی ہجری میں جب مسلمانوں کا تنزل غایت درجہ کو پہنچ چکا تھا اور ان کی دولت، عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل کے کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے۔ حسن اتفاق سے دارالخلافہ دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے۔ جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہاں کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتی تھیں اور جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں۔“

ہندرا خوش نفسا نند سخنور کہ بود — بادِ در خلوتِ شاں مشک فشاں از دم شاں
مومن و نیر و صہبائی، و علوی و انگاہ — حسرتی، اشرف، و آزردہ بود اعظم شاں

اگرچہ جس زمانے میں پہلی بار راقم کا دہلی سے باہر جانا ہوا اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی۔ کچھ لوگ دہلی سے باہر چلے گئے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو گئے تھے مگر جو باقی تھے اور جن کو دیکھنے کا مجھ کو

ہمیشہ فخر رہے گا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا کیونکہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچا بدل گیا۔ جس آب و ہوا میں انہوں نے نشو و نما پائی تھی وہ ہوا پک گئی۔

زمانہ وگر نہ آئیں نہاد شد آں مرغ کو بیضہ زریں نہاد

علی الخصوص مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ جن کی عظمت و شان اس سے بالاتر تھی کہ ان کو بارہویں یا تیرہویں صدی ہجری کے شاعروں یا انشا پردازوں میں شمار کیا جائے۔"(۱۸)

حالی جس تحریک سے جڑے تھے۔ اس کے بانی سرسید احمد خاں تھے اور سرسید کی زندگی کو قلم بند کرنا آسان کام نہیں تھا کیونکہ سرسید تحریک (۱) کے علاوہ ان کی شخصیت بھی ہمہ گیر تھی۔ اس لیے جب حالی نے سرسید پر قلم اٹھایا تو ان کو سات سال کا عرصہ لگا۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے یکتا ہے۔ اس کتاب کو حالی نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلے حصہ میں چھ باب ہیں اور دوسرے حصہ میں ان کے خدمات اور ان کے نتائج ہیں۔ حالی نے اس کتاب کو لکھنے میں جو دلیری کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ بقول مالک رام :

حالی کا مقصد سرسید کی تعریف کرنا نہیں تھا بلکہ انہوں نے بڑی سچائی اور صداقت سے سرسید کی خوبیاں اور کمزوریاں پیش کی ہیں۔ بہت سی جگہوں پر حالی نے سرسید کے نظریات سے اختلاف بھی کیا ہے۔ ..... حالی کو مخلوط رائے کے ساتھ ایک کتاب ملی جس میں بعض نے سرسید کی بہت تعریف کی ہے اور بعض نے ان کے کارناموں کو ایجادات سے تعبیر کیا ہے۔ اسّی سال گزر جانے کے بعد بھی ہم محسوس کرتے ہیں کہ اردو میں "حیات جاوید" سے بہتر سرسید کی دوسری سوانح عمری نہیں ہے۔(۱۹)

حالی کی یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں "حیات جاوید" کے نام سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ حالی کی جہاں نثری تصانیف عوام میں مقبول ہوئیں وہیں ان کی نظمیں بھی ہر دل عزیز ہوئیں۔ ان کی نثری خصوصیات میں سادگی اور بامحاورہ کے ساتھ پرلطف اور جاذبیت ہیں۔ وہ سادہ سلیس اور پرلطف نثر میں ہر طرح کے خیال اور مضامین کو بخوبی پیش کرتے ہیں۔ نظم میں زبان میں روانی اور خیال میں تسلسل قائم رکھتے ہیں ان کی نظموں کی فہرست طویل ہے اختصار کے لیے چند نظموں کا ذکر کیا جارہا ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ حالی نے غالب کی وفات پر ایک دلخراش نظم (مرثیہ) لکھی تھی۔ یہ مرثیہ ۱۸۶۹ء میں چھپ کر منظر عام پہ آیا۔

---

(۱) یا علی گڑھ تحریک

۱۸۷۴ء میں لاہور میں جدید طرز کا مشاعرہ ہوا تھا۔ جس کی بنیاد محمد حسین آزاد نے ڈالی تھی۔ جس کا نام "انجمن پنجاب" رکھا گیا تھا۔ اس مشاعرے کے لیے حالی نے مختلف نظمیں پیش کیں۔ جن میں "برکھارت" یہ مثنوی کی شکل میں لکھی گئی تھی۔ اس نظم کو ۳۱ر مئی ۱۸۷۴ء میں لاہور کے مشاعرہ میں پڑھا تھا۔ دوسری نظم "نشاط امید" تھی جو تیسرے مشاعرے میں پڑھی گئی۔ یہ بھی مثنوی کی شکل میں ہے۔ "حبِ وطن" ان کی مشہور نظم ہے۔ جو ۳۰ر ستمبر ۱۸۷۴ء کے لاہور کے مشاعرہ میں پڑھی گئی اور "مناظرہ رحم وانصاف" بھی انجمن پنجاب کے مشاعرے میں ۱۴ر نومبر ۱۸۷۴ء میں پڑھی گئی۔

"چپ کی داد" اور "مناجات بیوہ" حالی کی بے مثال مثنوی ہے۔ چپ کی داد ۱۹۰۵ء میں اور مناجات بیوہ ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس مثنویوں میں حالی نے ہندوستانی عورت کی سیرت اور بے لوث خدمات اور اس کی اہمیت کو پیش کیا ہے۔ اس مثنوی میں عورت پر ظلم وستم، ناانصافی وناقدری، بے توجہی وبے رخی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ حقوق سے محرومی اور دست برداری "چپ کی داد" میں اور ایک کم عمر بیوہ کے نفسیاتی جذبات کو "مناجات بیوہ" میں نظم کیا گیا ہے۔ مناجات بیوہ میں ایک عورت کی دلگداز داستان ہے جس کی نہ کہیں فریاد ہے نہ کہیں داد، وہ اپنی جنسی خواہشات کا دم توڑتی رہتی ہے اور گناہوں سے بچنے کی جدوجہد کرتی رہتی ہے۔ وہ پاک دامن کو بچاتی ہے اور زندگی دوسرے کے رحم و کرم پر بسر کرتی ہے۔ اس لیے محبت کا گلہ گھونٹتی ہے اور معشوق حقیقی سے محبت کی مناجات کرتی ہے۔ ان نظموں کا سماج پر اتنا اثر ہوا کہ لوگ بیوہ عورت سے شادی کے خواہش مند ہونے لگے۔ بقول مالک رام کے کہ :

> "حالی کی اس نظم کا اتنا اچھا اثر ہوا کہ کم سن بچوں کی شادی قانونی طور پر ممنوع قرار دی گئی۔ بیوہ کی دوسری شادی قانونی طور پر منظور کی گئی۔" (۲۰)

چپ کی داد میں عورتوں کی حالتِ زار کا بیان ہے اور جدید تعلیم سے عورتوں کو روشناس کرانے کی تاکید ہے۔

ان کی مشہور نظم "مسدس حالی" ہے۔ یہ مثنوی حالی کی مقبول ترین مثنوی ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے جس میں مسلمانوں کے نشیب وفراز کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس مثنوی کا نام "مدوجزر اسلام" تھا لیکن یہ "مسدس حالی" کے نام سے مقبول ہوئی۔

حالی کی دیگر نظمیں اور تصانیف درج ذیل ہیں :

مولود شریف (۱۸۶۴ء) مذہبی نوعیت کی کتاب ہے۔ تریاق مسموم (۱۸۶۷ء) یہ کتاب عماد الدین کی کتاب تحقیق الامام کا جواب ہے۔ مبادی علم ارضیات عربی کتابوں کا ترجمہ فرانسیسی میں ہوا اور فرانسیسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔

نظموں میں پھوٹ اور ان کا مناظرہ (۱۸۸۳ء) میں مثنوی کی شکل میں ہے۔ ضمیمہ مسدس حالی (۱۸۸۶ء) میں لکھا اس میں امید سے شروعات اور دعا پر خاتمہ ہوا ہے۔ شکوہ ہند (۱۸۸۸ء) میں قوم کا متوسط طبقہ ۱۸۹۱ء میں جشن قومی (۱۸۹۲ء) میں۔ مرثیہ سر سید احمد خاں (۱۸۹۸ء) میں اور مجموعہ نظم خاں (۱۸۹۰ء) میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ حالی اپنی آخری تصنیف کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ :

> ''میری سب سے آخری فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جو سر سید کی وفات پر میں نے ۱۸۹۸ء میں لکھی تھی اور اردو میں سب سے آخری وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس وکٹوریہ کی وفات پر لکھی ہے اور علی گڑھ گزٹ میں شائع ہو چکی ہے۔''(۲۱)

حالی اور ان کا عہد

حالی کی پیدائش شخصیت اور کارنامے ہم گذشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ اس ذیلی باب میں "حالی اور ان کا عہد" کے بارے میں بات کرنی ہے۔ کیونکہ تخلیق کار (خالق) کے عہد سے ناواقفیت سماجی تجربہ کے ساتھ ناانصافی ہے۔ چونکہ تخلیق خلا میں نہیں پیدا ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ سماجی تجربہ کے لیے حالی کے عہد سے واقفیت حاصل کر لی جائے۔

حالی جس سن میں پیدا ہوئے تھے وہ جاگیر دارانہ نظام کے بکھراؤ اور سماجی اقتصادی، تہذیبی و اخلاقی پریشانی و بحران کا دور تھا۔ یہ سماج تاریخی زوال کا نتیجہ تھا جو اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد تیزی سے انحطاط کی طرف جا رہا تھا اور اس پر انگریزوں کا تسلط بڑھ رہا تھا۔ اورنگ زیب تیموری خاندان کا وہ آخری بادشاہ تھا جس کی شان و شوکت جاہ و جلال اور حکومت کی وسعت اپنے عہد میں بے مثال تھی۔

> "پچاس سال تک اورنگ زیب کے ہاتھ میں ایک ایسی مملکت کی باگ ڈور رہی جس کی ہمسری کا دعویٰ کیا۔ باعتبار رقبہ آبادی اور کیا باعتبار دولت کیا۔ اس عصر کی پوری دنیا کی مملکتوں میں سے کوئی بھی نہ کر سکتی تھی۔" (۲۲)

اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے بہادر شاہ ظفر تک،(۱) پچاس سال کے اندر تیموری خاندان کی عزت اور سلطنت کو برقرار رکھنے والا کوئی جاں نثار بہادر پیدا نہیں ہوا جو اپنے باپ دادا کی حکومت کو سنبھال سکتا۔ بقول ثروت صولت :

---

(۱) دہلی کے آخری تیموری سلاطین اورنگ زیب کے بعد :

محمد شاہ	۱۷۲۰ء سے	۱۷۴۸ء تک
احمد شاہ	۱۷۴۸ء سے	۱۷۵۴ء تک
عالمگیر ثانی	۱۷۵۴ء سے	۱۷۵۹ء تک
شاہ عالم ثانی	۱۷۵۹ء سے	۱۸۰۶ء تک
اکبر شاہ ثانی	۱۸۰۶ء سے	۱۸۳۷ء تک
بہادر شاہ	۱۸۳۷ء سے	۱۸۵۷ء تک
	وفات ۱۸۶۲ء رنگون میں	

دہلی کا تیموری تاجدار بہادر شاہ (۱۷۲۰ء سے ۱۷۴۸ء) اپنے باپ دادا کی تمام خوبیوں سے محروم تھا۔ آرام طلبی اور عیش پسند تھا۔ انتظامی صلاحیت تدبیر اور دور اندیشی سے کوسوں دور تھا۔ (۲۳)

جب بادشاہ خود اپنی ذمہ داری سے دست بر داری کرے اور عیش و عشرت کی زندگی گذارے، آرام طلبی، محنت و مشقت سے فرار، قربانی اور جاں بازی سے گریز، موت سے خائف اور دنیا کا طالب، بد دیانتی اور خود غرضی جیسی مسموم برائیاں سرایت کر جائیں تو امراء اور روساء کا اندازہ لگانا بہت مشکل نہ ہوگا۔ جس طرح کی برائیاں رائج ہو سکتی تھیں سب موجود تھیں۔ ''سخت اورنگ زیب کی جگہ محمد شاہ رنگیلے جیسے اشخاص بابر اور اورنگ زیب کے جانشین ہونے لگے تو اس کا نتیجہ زوال کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔'' (۲۴)

اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب تیموری سلطنت کا زوال ہونے لگا تو ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا اور انگریز ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے لگے۔ تجارتی قلعوں میں فوجوں کی تعداد بڑھانی شروع کی۔ (۱) انگریز ان فوجوں کی مدد سے ریاستوں کو کمزور کرنے لگے اور اپنی چال بازی سے ایک ریاست کو دوسری ریاست سے لڑا کر ان کی طاقت کو کمزور کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ اپنی سازش میں کامیاب ہوتے رہے اور دوسرے علاقوں پر قبضہ جماتے رہے۔ ۲۲/ جون ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ ان کے مقابلے میں ستر ہزار فوج کو لے کر پلاسی کے میدان میں جنگ کے لیے اترا، انگریز چونکہ سازش کا جال بچھا چکے تھے، جدید اسلحہ سے لیس صرف تین ہزار فوج سے سراج الدولہ کو شکست دے دی اور بنگال پر قبضہ جما لیا۔

۱۸۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں شجاع الدولہ کی شکست کے بعد اودھ کی ریاست انگریزوں کے زیر اثر آگئی۔ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت ہو گئی اور انگریز کا سب سے بڑا طاقتور حریف ختم ہو گیا اور نظام علی خاں ان کے مقابلے میں بے بس ہو گیا۔ (۲۵) اس کی رہی سہی آزادی ۱۸۰۰ء میں ختم کر دی گئی اور اب حیدر آباد انگریزوں کی محکوم ریاست بن گئی۔

۱۷۹۵ء کے بعد مرہٹے بھی خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے۔ اس طرح اب انگریز بے خوف و خطر ہندوستان کے مالک بن گئے اور اب کسی کے اندر ان کے مقابلے کی طاقت بھی نہ رہی۔ نظام دکن نے بالادستی قبول کر لی۔ ۱۸۰۳ء میں مرہٹوں

---

(۱) یورپی قوموں میں انگریزوں، فرانسیسیوں اور پرتگالیوں نے دہلی کے تیموری بادشاہوں سے برصغیر میں تجارت کرنے کی اجازت لے رکھی تھی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے مختلف مقامات پر زمینیں خرید کر تجارتی کوٹھیاں بنانی شروع کی۔ بعد میں حفاظت کے بہانے ان کوٹھیوں کو قلعہ میں بدل دیا گیا اور دھیرے دھیرے خفیہ طور پر فوج رکھنے لگے جب علی وردی خاں کا نواسہ کلکتہ (مرشد آباد) کے تخت پر بیٹھا تو انگریزوں کو قابو میں نہیں کر سکا۔ انگریز بنگال میں سازش کا جال بچھا چکے تھے۔ اس لیے قلیل فوج کے باوجود بھی وہ سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال پر قبضہ کر لیا۔

سے انگریزوں نے آگرہ، دہلی اور علی گڑھ چھین لیا۔ دہلی میں بہادر شاہ ظفر کی طاقت ختم ہو چکی تھی اور حکومت لال قلعے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اخراجات انگریزوں کے پینشن پر منحصر تھا۔ اس طرح اب انگریز ایک حاکم کی حیثیت سے ہندوستان پر حکومت کرنے لگے مسلمانوں اور ہندوؤں کے جاگیریں ضبط ہوتی گئیں۔ انگریز اپنے مفاد کے لیے نئے جاگیر دار پیدا کرنے لگے۔

اس طرح انگریزوں کی آمد سے نہ صرف اب سیاسی نظام میں تبدیلی آئی بلکہ ہندوستان کی سماجی، اقتصادی اور مذہبی تصورات کی جڑیں بھی کمزور ہونے لگیں۔ امیر غریب بن گئے، زمین دار بھومی ہین ہو گئے، شاہ محتاج ہو گیا، کاشتکار اور دستکار بے روزگار ہو گئے۔ بلکہ پورے معاشرے کا نظام بدل گیا۔ بقول تاراچند :

> "صنعتی انقلاب کے آجانے سے انگلستان سوتی کپڑوں اور دوسرے اشیاء کا وسیع پیمانے پر تیار کرنے والا ہو گیا اور اشیاء کا جو تبادلہ دونوں کے درمیان تھا وہ الٹ گیا۔ ہندوستان کے ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے انگلستان کے مشین سے تیار کیے ہوئے کپڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ہندوستان کی تجارت تباہ و برباد ہو گئی۔ گاؤں کے کاریگروں اور جولاہوں کا ذریعہ معاش جاتا رہا اور بہت جلد وہ بھومی ہین مزدور میں تبدیل ہو گئے۔ مالگذاری کی جو پالیسی حکومت نے اختیار کی اور موضع کی صنعت کی بربادی، ان دونوں نے مل کر گاؤں کے قدیم منظم معاشرے کو پارہ پارہ کر دیا۔" (۲۶)

اس بربادی کا شکار زیادہ تر مسلمان تھے۔ مسلمانوں کے امیر طبقوں کو برباد کرنے کی پوری سازش تھی اور مسلمان حکمرانوں کو تہس نہس کر دیا گیا تھا۔ ان کی ریاستیں یکے بعد دیگرے ضبط کر لی گئی تھیں۔ مسلمانوں کے صنعتوں کو برباد کر دیا گیا تھا۔ جو بقول تاراچند :

> "کاریگر طبقہ پر دوسمت سے حملہ تھا۔ اول تو بڑی ٹیکس کی اس مذموم پالیسی سے جو برطانیہ نے اپنے صنعتی انقلاب کی ابتداء میں اختیار کیا تھا اور دوسرے صنعتی انقلاب کے بعد فیکٹریوں میں تیار کی ہوئی اشیاء سے مقابلہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی گھریلو صنعت برباد ہو گئی اور کاریگر بھوکوں مرنے لگے اور یہ زیادہ تر مسلمان تھے۔" (۲۷)

انگریز نہ صرف مسلمانوں کی طاقت کو کمزور کرنے کی کوشش میں تھے بلکہ مسلمانوں کے مذہبی رسومات اور مذہبی عقائد پر بھی شدید ضرب لگاتے تھے۔ انگریزوں کو یہ احساس تھا کہ جب تک مسلمان اپنی مذہبی عقائد کے پابند ہوں گے، ان کو قابو میں رکھ پانا مشکل ہو گا اور یہ ہمیشہ حکومت کے لیے خطرہ بنے رہیں گے۔ اس لیے انگریزوں نے مذہبی عقائد کو بدلنے کے لیے مشنریوں کو دعوت دی تاکہ حکومت کے لیے یہ معاون بن جائیں کیونکہ جب تک مذہبی

تصادم باقی رہے گا حکومت کی رسی کمزور ہوتی رہے گی۔ ان مشنریوں سے جہاں اقتدار حاصل کرنے میں سہولت ہوئی وہیں عیسائیت کا فروغ بھی ہوا۔ بقول عبداللہ :

> ''سچ یہ ہے کہ ان کی سرگرمیوں سے ہندوستان میں رائج شدہ تمام ادیان و مذاہب کو حقیقی خطرہ تھا۔ مگر اسلام پر مشنریوں کے حملوں کی زد بہت زیادہ منظم اور زیادہ سخت تھی۔ اس لیے کہ اسلام و عیسائیت دونوں سامی الاصل مذاہب تھے اور دونوں کی بنیادی اصطلاحات کسی حد تک متحد اور باہم مانوس ہونے کے علاوہ دونوں کے ارکان و عقائد کا معتدبہ حصہ باہم مشترک بھی تھا اس وجہ سے اوروں کے مقابلے میں مسلمانوں کو مغالطے میں ڈالنے کی کوشش زیادہ کامیاب ہوسکتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ ایک سیاسی حربہ بھی تھا کیونکہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے اثرات کو دور کرنے اور اس کے دوبارہ وجود میں آنے کے امکانات کو ختم کرنے کے لیے بے حد ضروری سمجھا گیا تھا کہ مسلمان کے دینی و مذہبی احساس کو جہاں تک ممکن ہو مٹادیا جائے تاکہ دینی تنظیم کی ابتداء کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی یکجہتی بھی ختم ہو جائے۔(۲۸)

صنعتی انقلاب کے بعد انگلستان میں جو تبدیلی آئی اس کا اثر ہندوستان پر بھی پڑنے لگا۔ اٹھارہویں صدی میں صنعتی انقلاب کی وجہ سے نئے نئے مسائل پیدا ہونے لگے۔ نئی نئی طاقتیں ابھرنے لگیں، دولت پیدا کرنے کے نئے نئے ذرائع تلاش کیے جانے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ سوچنے کے انداز میں اور اخلاق و کردار میں خاصی تبدیلی آنی شروع ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی پارلیامنٹ بھی ان چیزوں پر غور کر کے ان برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ انگلستان اب اور تیزی کے ساتھ ایک صنعتی ملک بن رہا تھا۔ سائنس، ٹکنالوجی اور صنعت میں یورپ کی قیادت کر رہا تھا۔ اس طرح اقتدار اور طاقت کی غیر محدود کوشش جاری ہوگئی۔ اس صنعتی ترقی کی وجہ سے مساوات، آزادی اور انسانی برابری جیسے تصورات رائج ہونے لگے۔ جاگیردارانہ نظام ختم ہونے لگا۔ اس طرح یہ پوری صدی اتھل پتھل کی صدی تھی۔ ''براعظم پر والیٹر، روسو اور کانٹ اس انقلاب کے ازروئے کردار، جذبات اور خیالات کے علمبردار تھے۔''(۲۹)

بقول تاراچند :

> ''فلسفیانہ تحریک کے علاوہ مذہبی زندگی میں بھی ایک گہری ہل چل تھی۔ یہ اس آزاد مشنری اور اخلاقی ابتری کے خلاف جو جارج اول سے ملکہ وکٹوریہ تک کے عہد میں پھیلی ہوئی تھی، ایک زبردست رد عمل تھا۔ مذہب کے اس احیاء جدید کے ''وسلے'' اور ''ویکفیلڈ'' دو لیڈر تھے جنہوں نے اپنے کو اس

---

(۱) تفصیل کے لیے حیاتِ جاوید کے دوسرے حصے سے استعاب کریں۔

TH — 8258

لیے وقف کر دیا تھا اور جس کا نام "میتھوڈازم" ہوا۔ یہ لوگ گاؤں اور چھوٹے چھوٹے قصبات کے عام آدمیوں یعنی قلی، مل مزدور، ملاح، تجار، دوکاندار اور محنت کش کو خطاب کرتے تھے۔ وہ انسانی فسق و فجور کی مذمت کرتے اور لوگوں کو دعوت دیتے کہ وہ سوچ سمجھ کر اپنے آپ کو بدلیں اور اپنے اندر پاکیزگی پیدا کریں اور وعدہ کرتے تھے کہ اس طرح وہ نجات اور اجر آخرت کے مستحق ہوں گے جیسا کہ اس تاریخ کا جدید ترین کہتا ہے کہ "اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ بغیر اس کے (یعنی میتھوڈازم) یا اسی کے مثل کسی تازہ دم کرنے والے آلے کے انگلستان تباہ کن زوال کے عہد میں داخل ہو جاتا۔" (۳۰)

0,168,1,M37,2:g DISS 168P0

یہاں تاریخی شواہد اس لیے پیش کیے جا رہے ہیں کہ اس کا اثر ہندوستان پر بلاواسطہ اور بالواسطہ پڑا ہے۔ یہاں پہلے تجار آئے تھے اس لیے وہ صنعتی انقلاب کے نتائج سے بخوبی واقف تھے۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ دور اقتصادی لحاظ سے انتشار و خلفشار کا دور تھا اور مذہبی اعتبار سے بحث و مناظرے کا دور تھا۔ جدید نظریات، جدید تحقیقات اور جدید ترقیات کی وجہ سے مشرق و مغرب، جدید و قدیم عقل و مذہب، جاگیرداری اور بادشاہی، علم و عمل ہر طرف تصادم نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں اس کا واضح اور بہت تیزی سے اثر پڑ رہا تھا۔ حالی حیاتِ جاوید میں اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ :

"ہندوستان میں اسلام تین خطروں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری اس گھات میں لگے ہوئے تھے۔ اگرچہ قحط کے دوران میں ان کو دبلا پتلا شکار پیٹ بھرا مل جاتا تھا مگر وہ اس پر قانع نہ تھے اور ہمیشہ صید فربہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ ان کا دانت مسلمانوں پر تھا۔ اس لیے ان کی منادیوں میں ان کے اخباروں میں اور ان کے رسالوں میں زیادہ تر بوچھار اسلام پر ہوتی تھی اسلام کی تعلیم کی طرح طرح برائیاں ظاہر کرتے تھے بانیٔ اسلام کے اخلاق و عادات پر انواع و اقسام کی نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے مسلمان کچھ ناواقفیت اور بے عملی کے سبب اور اکثر افلاس کے سبب ان کے دام میں آ گئے۔ (۱)

دوسرا خطرہ جو پہلے سے زیادہ خوفناک تھا وہ مسلمانوں کی پولیٹیکل حالات سے علاقہ رکھتا تھا۔ اول تو مسلمان اس نظر سے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلش قوم نے مسلمانوں سے لی تھی، ہمیشہ حکمراں کی نگاہ میں کھٹکتے تھے۔ دوسرے سبب ان غلط فہمیوں کے جو یورپ کی تمام عیسائی قوموں میں اسلام کی

---

(۱) بعض علماء اسلام جیسے مولانا رحمت اللہ مرحوم اور مولوی آل حسن اور ڈاکٹر وزیر خاں متنبہ ہوئے انہوں نے متعدد کتابیں عیسائیوں کے مقابلے لکھیں اور ان سے بالمشافہ مناظرہ کیے جس سے یقیناً مسلمانوں کو بہت فائدہ ہوا۔

Jawaharlal Nehru University Library

نسبت پھیلی ہوئی تھیں۔ انگریز مسلمانوں کے مذہب کو یعنی فساد کا سرچشمہ اور امن و عافیت کا دشمن خیال کرتے تھے۔

تیسرا خطرہ خاص کر مذہب اسلام کو انگریزی تعلیم کی طرف سے تھا جو روز بروز ہندوستان میں پھیلتی جاتی تھی اور جس سے ہندوستانیوں کو کسی طرح مفر نہ تھا۔(۳۱)

ایسے پر فتن دور میں چند مصلحین اور احیاء اسلام کے شائقین و مفکرین نے اپنے پختہ نظریات کو عوام کے سامنے پیش کیے۔ یہ رجحانات ہندوؤں میں زیادہ ملتا ہے۔ انہوں نے حالات کا اندازہ لگا کر اپنی قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا جن میں راجارام موہن رائے نے "برہمو سماج"، سوامی دیانند نے "آریہ سماج" اور دھرلو نائڈو نے "وید سماج" کی بنیاد ڈالی اور مسلمانوں میں سید احمد شہید نے مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی، نواب عبداللطیب نے محمڈن لٹریری سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور سر سید احمد نے علی گڑھ تحریک کی بنیاد ڈالی۔ ان سب میں علی گڑھ تحریک زیادہ پر اثر اور کامیاب تحریک رہی۔

سر سید احمد سے قبل شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء سے ۱۷۶۳ء) کی اصلاح مذہب کی تحریک چل رہی تھی۔ شاہ ولی اللہ، مجدد الف ثانی (عہد اکبر) کی اصلاحی تحریک سے متاثر تھے۔ مسلمانوں میں رائج مذموم و مسموم رسومات، بدعات کو ختم کرنے کے لیے شاہ ولی اللہ نے اصلاحی تحریک کی رفتار کو تیز کر دیا اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اس بات کی تلقین کی کہ اختلافات کی صورت میں انتہا پسندی کی جگہ اعتدال سے کام لیا جائے۔(۳۲)

شاہ ولی اللہ کی تحریک ان کی حیات میں فروغ نہ پا سکی اور یہ اس قدر ممکن بھی نہ تھا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے دور کے سیاسی اور اقتصادی حالات کا صحیح تجزیہ کیا اور اس پس منظر میں ایسے اصول مرتب کیے جو صنعتی طبقے کے غلامانہ ذہنیت کو دور کر کے اس کو جاگیرداروں کے مقابلے میں ابھار سکیں۔ جس کی وجہ سے اسلامی حکومت کا قیام ممکن ہو سکے۔(۳۳)

انگریزوں کے ظلم و استبداد کی وجہ سے یہ تحریک شاہ عبدالعزیز اور سید احمد شہید تک آتے آتے کمزور ہونے لگی تھی۔ سر سید احمد کی پیدائش کا بھی یہی دور ہے۔ اس دور میں مذہبی اور سیاسی تصادم اور معرکے چل رہے تھے۔ مذہبی تصادم کی جدید تحریکوں کی اولیں علمبردار عیسائی مشنریاں تھیں۔ ان مشنریوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے ہر طرف مذہبی مباحثوں کے دروازے کھل گئے تھے۔ جس کے وجہ سے فرقہ بندی کی جنگ زیادہ مشتعل ہو گئی۔ مذہبی تقدس کو باقی رکھ پانا مشکل نظر آرہا تھا۔ علمائے دین مذہبی تقدس کو باقی رکھنے کی کوشش میں انگریزوں کی مخالفت کی انتہا تک پہونچ گئے۔ ان عالموں کی سختی کی وجہ سے انگریز پھر اٹھے اور مسلمانوں کے دشمن بن گئے۔ شاہ عبدالعزیز اور ان کے قریبی رشتہ

دار مولانا عبد الحئ نے بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ انگریزوں کے مقبوضہ علاقوں کو دار الحرب کا فتوا دے دیا۔ اس شدت پسندی کی وجہ سے انگریز برانگیختہ ہو گئے۔ (۳۴)

سر سید احمد اور ان کے رفقاء حالات کے زیر و بام کو دیکھ چکے تھے۔ ان کو اس بات کا احساس ہونے لگا کہ اب اسلام کی احیاء اور بقا نہ صرف قدیم طرز کی تعلیم پر منحصر نہیں ہو گا بلکہ جدید تعلیمی نظام اور جدید علوم و فنون کو سمجھ کر اسلامی نظریات کو اس کی روشنی میں پیش کرنے پر ہو گا۔ اس سے وہ بخوبی واقف تھے کہ بغیر تعلیم کے اصلاح ممکن نہیں ہے۔ اس لیے سر سید اور ان کے ہم نوا مسلمانوں کی توجہ تعلیم کی طرف مبذول کرانے لگے۔ سر سید احمد یہ دیکھ رہے تھے کہ ہندو انگریزی تعلیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں جب کہ مسلمان اس سے متنفر ہیں۔ حالی نے ان حالات کا ذکر حیاتِ جاوید میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

> "مسلمان پہلے ہی انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ ابتداء سے ہندوؤں و مسلمانوں کے خیالات میں جو تفاوت انگریزی تعلیم کے متعلق تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۲۴ء میں جب گورنمنٹ نے کلکتہ میں ہندوؤں کے لیے ایک سنسکرت انجمن قائم کیا تو ہندوؤں نے ایک عرضداشت اس مضمون کی گذارنی کی کہ ہم کو اس بات کی ضرورت نہیں کہ گورنمنٹ ہمارے لیے سنسکرت کی تعلیم کا سامان مہیا کرے بلکہ اس کو چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو انگریزی تعلیم کی اشاعت میں کوشش کرے بر خلاف اس کے ۱۸۳۵ء میں جب کہ یہ واقعہ مذکورہ پر گیارہ برس گذر چکے تھے اور ہندوؤں کا شوق دوبالا ہو گیا تھا۔ کلکتہ کے مسلمانوں نے جس وقت یہ سنا کہ گورنمنٹ تمام ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتی ہے تو انہوں نے ایک عرضی تیار کی جس پر آٹھ ہزار مسلمانوں، رئیسوں اور عالموں کے دستخط تھے اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر اس قدر توجہ کرنا صاف دلالت کرتا ہے کہ اس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔ (۳۵)

غرض اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انگریزی تعلیم کے خلاف شدت پسندی کہاں تک تھی اور سر سید کو اس بات کا احساس تھا کہ قوم کی اصلاح بغیر جدید تعلیم کے ممکن نہیں۔ اس لیے اس راستے میں کتنے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔ اس کا ذکر یہاں محال ہے۔

دوسری طرف انگریزی تعلیم سے بُعد ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا سیاسی، معاشی اور تہذیبی وقار ختم ہو رہا تھا۔ اس لیے سر سید احمد خاں اس بات پر زور دے رہے تھے کہ جدید علوم سے نا آشنائی کے سبب نہ صرف مذہبی بحران کا سامنا کرنا پڑے گا بلکہ مسلمانوں کی سیاسی اور اقتصادی وجود بھی ختم ہو جائے گی اور اس طرح یہ اپنا تشخص کھو دیں گے اور

عیسائیت میں ضم ہو جائیں گے۔ اس لیے مذہبی بقاء کے لیے جدید تعلیم کا حصول بھی ضروری ہے۔ اس لیے سر سید احمد خاں جدید تعلیمی نظام اور جدید علوم کے ذریعہ اسلامی نظریات کو پیش کرنے پر زور دینے لگے تھے جس کو سر سید کا عقلی یا فطری نظریہ کہتے ہیں اور اسی نظریے کے ذریعہ اسلام کو جانچنے و پرکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سر سید کا یہی وہ مذہبی نظریہ جو عقلی یا فطری ہے نے اسلام کی بہت سی چیزوں سے بُعد پیدا کر دیا اور اسلام کی وہ تمام چیزیں جو عقلی دائرے سے باہر ہیں اس سے سر سید نے سرے سے انکار کر دیا ہے۔ مثلاً معراج، ناسخ منسوخ، آدم و ابلیس، ملائکہ، وفات مسیح وغیرہ جو اسلام میں جمہور رائے کے خلاف ہے۔ بقول عبداللہ :

> "سر سید احمد کی نظر میں دین اور سیاست دو جدا شعبے نہ تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے سیاسی مسائل کو حل کرتے وقت دین سے امداد لی اور سیاسی مغائروں کو دور کرنے کے معاملے میں بھی مذہب کی سند لی۔ اس معاملے میں ان کا نقطۂ نظر سراپا مذہبی معلوم ہوتا ہے۔ سیاست کی بحثوں میں غالباً انہوں نے تمدنی، جغرافیائی، اقتصادی اور عقلی معیاروں کو بہت کم مدِ نظر رکھا ہے۔ حالات کے ماتحت ان کا مطمحِ نظر ملکی و جغرافیائی کم تھا۔ دینی و مذہبی زیادہ تھا اور شاید یہ ہندوستان کی پر پیچ سیاسی فضا میں قدرتی بھی تھا۔ (۳۶)

حالی اس پر یوں رقمطراز ہیں :

> "انہوں نے دنیوی تعلقات کو جن کے بغیر قوم کی خیر خواہی اور قوم کو نفع پہنچانا غیر ممکن تھا۔ قطع تعلق سے ہزار درجہ بہتر سمجھا اور اپنی تمام زندگی اور طاقت، استطاعت اور اپنے تمام قویٰ کو نفس واپسی تک قومی خدمت اور قومی خیر خواہی کے لیے وقف کر دیا۔ ..... مسلمان دنیوی عزت میں حد سے زیادہ گرے ہوئے ہیں اور گرتے چلے جاتے ہیں اور مسلمانوں کی ذلت بعینہ اسلام کی ذلت ہے۔ اگرچہ چند روز ان کا یہی حال رہا تو ہندوستان میں ان کا عدم وجود برابر ہو جائے گا اور اسلام اس ملک سے رخصت ہو جائے گا۔ اس لیے انہوں نے قوم کو اول دنیا ہی کی طرف متوجہ کیا اور جو ذریعے ان کی دنیوی ترقیات کے تھے ان کے لیے مہیا کیے۔ سب سے زیادہ ان کی ترقی کا مدار انگریزی تعلیم پر سمجھا۔ (۳۷)

انگریزی زبان کے فروغ کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ۱۸۳۵ء میں حکومت نے مغربی تعلیم کو لازمی قرار دے دیا اور اس کے حصول کے لیے عوام کو مجبور کیا۔ اور مسلمان علماء کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ انگریزی تعلیم سے مسلمان عیسائی مذہب قبول کر لیں گے، اس لیے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے دور رکھنے کی کوششیں کیں۔ ۱۸۳۷ء میں حکومت نے عدالت کی زبان فارسی کی جگہ انگریزی کر دی۔ عدالتوں میں زیادہ تر ملازمین مسلمان تھے۔ اس لیے انگریزی

سے ناواقفیت کی وجہ سے ملازمتوں سے بر طرف کر دیے گئے۔ اور صنعتی انقلاب کی وجہ سے مسلمانوں کی دستکاری بھی ختم ہو چکی تھی۔ اس طرح مسلمانوں میں بے روزگاری بہت بڑھ گئی اور ان حالات کی وجہ سے انگریزوں اور مسلمانوں میں کافی دوری پیدا ہو چکی تھی۔ انگریزوں اور مسلمانوں میں سوشل تعلقات پیدا کرنے اور مسلمانوں میں انگریزی کی طرف سے غیرت اور بیگانگی کے احساس کو دور کرنے کے لیے یہ نہایت ضروری تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں انگریزی کی خیر و برکت کا سکہ بٹھایا جائے۔ لیکن یہ سب اسی وقت ممکن تھا جب انگریزی تعلیم کی اہمیت وافادیت کو عوام کے سامنے پیش کیا جائے۔ (۳۸)

سر سید احمد خاں کے سامنے احیاء اسلام کی تحریک دم توڑ چکی تھی اور تمام کوششوں کے باوجود ناکام رہی۔ (۱)

اور ہندوستان کے ہندوں قوم بجائے مخالفت کے انگریزی شعار اختیار کرنے لگے اور انگریزی حکومت میں ہاتھ بٹانے لگے۔ سر سید حالات کا بغور مطالعہ کر کے اس نتیجے پر پہونچے کہ مسلمانوں کی ترقی انگریزوں کی معاونت اور انگریزی تعلیم کے حصول میں ہے۔ بقول معین حسن جذبی :

> ان کی نظر میں ملکی ترقی تعلیمی ترقی کے مترادف تھی جس پر اعلیٰ ملازمتوں کا دار و مدار تھا اور اعلیٰ ملازمتیں اس لیے بھی ضروری تھیں کہ ان کے بغیر مسلمان کو سیاسی میدان میں کوئی درجہ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ (۳۹)

یہ امر قابل ذکر ہے کہ جب انگریزی مشنریوں کی آمد تیز ہوگئی اور وہ اسلام پر طرح طرح کے اعتراضات کرنے لگیں تو سر سید احمد ان کے جواب دینے اور مصالحت کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کوشش میں سر سید مذہبی حدود سے تجاوز کر گئے اور جمہور رائے سے اختلاف کرنے لگے۔ تبیین الکلام، تفسیر القرآن، خطبات احمدیہ وغیرہ کتابیں انہوں نے اسی اغراض ومقاصد کے تحت تصنیف کیں۔

تبیین الکلام میں انہوں نے تقابل مذہب کی منصفانہ اور حق پسندانہ تحریک پر زور دیا ہے۔ تفسیر القرآن میں قرآن مجید کے جغرافیائی اور تاریخی عقیدوں کی وضاحت اسلامی نظریہ کے مطابق کی ہے اور ان مسائل کو جس پر علماء کی طرف سے زبردست اعتراضات ہوئے، عقل، فطرت اور تمدن کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ خطبات احمدیہ میں سر ولیم میور کے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو اس نے آپ ﷺ کی زندگی پر کیے تھے۔ (۴۰)

---

(۱) تفصیل کے لیے شاہ ولی اللہ اور جہاد کا مطالعہ سے استعاب کرے۔ (ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، جلد دوم، ثروت صولت ص : ۳۶۹)

سر سید احمد کا دین کے متعلق یہ نظریہ تھا کہ دین کا محور صرف قرآن ہے باقی اصول دین میں شامل نہیں ہے۔ اس لیے حدیث، اجماع اور قیاس کی اہمیت اصول دین کے لیے ضروری نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سر سید کے رفقاء دینی معاملے میں ان سے جدا نظر آتے ہیں اور اس نظریے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم شبلی ہیں۔

شبلی کے اکثر تصانیف اور مضامین فلسفیانہ مبحث اور عقلی دلائل سے عبارت ہیں۔ انہوں نے اکثر تحریروں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام کو جدید علوم اور جدید تمدن سے مطابقت دی جائے اور فلسفۂ حالی کے ان مسائل کی تشریح کی جائے جو مذہب سے بظاہر ٹکراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ جہاں تک مذہبی معاملے میں عقل ساتھ دے خوب استعمال کیا جائے۔ لیکن جہاں عقل تھک جائے عقل کا استعمال کر کے مذہب کو مسخ نہ کیا جائے۔ بقول سید عبداللہ کے :

> مذہب اور عقل کے باہمی تعلق کے سلسلے میں شبلی قدرتاً عقل کے استعمال کو ضروری خیال کرتے ہیں ادراکِ حقائق کے معاملے میں ایک منزل ایسی بھی آجاتی ہے جہاں عقل بے کار ہو کر رہ جاتی ہے۔(۴۱)

شبلی انہی نظریات کو اپنی کتب اور مقالات میں پیش کرتے ہیں اور جدید علوم سے فائدہ اٹھانے کی تائید بھی کرتے ہیں لیکن جدید علوم کو بغیر سمجھے تسلیم کرنا احمقانہ فعل سمجھتے ہیں۔ وہ جدید رجحانات کی تاویل کو جدید علوم کے ذریعہ قدیم عقائد کی تائید کے لیے استعمال کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور یہی سر سید اور شبلی میں بنیادی فرق ہے۔ بقول سید عبد اللہ :

> ان کے اور سر سید کے نظریۂ دینی میں بظاہر فرق یہ ہے کہ سر سید صاحب قدیم کو ایسے رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ اس سے تمدن اور زندگی کے لیے نئے رجحانات کی تائید ہو۔ اس کے برعکس شبلی جدید رجحانات کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ اس سے قدیم عقائد کی تاویل نکلتی ہو۔ سر سید کی نظریہ جدید دورِ حاضر پر مرکوز ہے۔ شبلی کی نگاہ قدیم اصول پر جمی ہوئی ہے۔(۴۲)

اس دور میں جو سب سے بڑا معرکتہ آراء مسئلہ تھا وہ یہ کہ اسلام تمدن و ترقی کی راہ میں مانع ہے۔ اس کے جواز میں بیشتر مفکرین اسلام نے اپنی رائے ظاہر کی۔ شبلی کی نگاہ میں اصل ترقی اور تمدن اسلام کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو ترقی کے لیے ضروری ہیں۔

> "تمدن کی ترقی کے جتنے اسباب ہیں وہ سب اسلام میں پائے جاتے ہیں مثلاً مساوات، مذہبی بے تعصبی آپ اپنی عزت کا خیال، جمہوریت، علمی ترقی کی انتہاء، تقسیم عمل، دین و دنیا کا باہمی تعلق، عملی زندگی

کا اتبّا اور رہبانیت سے نفرت وغیرہ۔"(۴۳)

سید عبداللہ اس کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ :

"مختلف قوموں کے باہمی تعلقات کے متعلق بھی ان کے خیال میں اسلام نے جو راہ عمل وضع کی ہے وہ اسے ترقی اور تمدن کا موید قرار دیتی ہے۔ نیز اسلام کا قانونِ وراثت اور اسلام کا عورتوں کے متعلق قانون نہایت مفید اور معقول ہے اور دنیا کے دیگر قوانین اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔(۴۴)

شبلی کا خیال تھا کہ کوئی قوم محض ماضی پر تکیہ کر کے اور قدامت پسندی کے حدود میں محصور ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی ہے۔ قوم کی زندگی کے لیے شرط ہے کہ بیدار ذہن رکھے اور بیدار ذہن کسی ایک جگہ تکیہ نہیں کر سکتا۔

ظفر احمد صدیقی تحریر فرماتے ہیں کہ :

"زندگی اور اس کے حقائق و مسائل کے بارے میں بھی وہ محض ایک رخ یا ایک زاویے پر سوچنے کے عادی نہ تھے بلکہ وہ مسئلے کے ہر پہلو کو سامنے رکھتے تھے۔ مثلاً ان کا خیال تھا کہ کوئی قوم محض ماضی پر اور قدامت پسندی کے دائرہ میں محصور ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ساتھ ہی وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ محض تجدید پسندی پر انحصار اور اپنی روایت سے یکسر انقطاع بھی باخبر اور بیدار مغز قوموں کا شیوہ وشعار نہیں۔"(۴۵)

اس کے علاوہ بھی اس عہد کے بہت سے مصنفین اور مفکرین نے ان موضوعات پر قلم اٹھانے اور اپنے اپنے نظریات پیش کیے۔ سر سید احمد کے رفقاء میں مولوی نذیر احمد اور مولوی چراغ علی بھی قابل ذکر شخصیت ہیں۔

مولوی چراغ علی بڑے پایے کے انشاء پرداز تھے۔ ان کی اکثر تصانیف انگریزی میں ہیں۔ اردو میں ان کے مختلف مضامین شائع ہوئے جن میں "اسلام کی دنیوی برکتیں"، "قدیم قوموں کی تاریخ"، "بی بی ہاجرہ"، "ماریہ قبطیہ"، "تعلیق نیاز نامہ" وغیرہ اہم ہیں۔ انہوں نے اس دور کے زیر بحث موضوعات کی طرف اور چھوٹے چھوٹے مگر اہم مسائل کی طرف بھی خصوصی طور پر توجہ کی ہے۔ جن میں "اسلام بزور شمشیر نہیں پھیلا"، "اسلام کی لڑائیاں مدافعانہ تھیں"، "فقہ و حدیث بطور ایک حجیت شرعی واجب تسلیم نہیں"، "قرآن میں جہاد محض محنت و مشقت کے معنی میں استعمال ہے"، "اسلام نے لونڈی کو غلام بنانے کا حکم نہیں دیا" اور "بی بی ماریہ آنحضرت ﷺ کی حرم نہ تھی" وغیرہ مضامین لکھ کر دور جدید کے اعتراضات کی مدافعت کرنے کی کوشش کی۔

نذیر احمد نے بھی انہیں مسائل کو اپنی کتاب اور مضامین میں پیش کیا ہے۔ ان کی مشہور کتابیں "ترجمہ قرآن" اور "الحقوق والفرائض" ہیں۔ نذیر احمد بھی جدید تعلیم کے حصول کے قائل نظر آتے ہیں اور قوم کی ان برائیوں کو دفع

کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو ترقی کے لیے مانع ہیں جس میں تقدیر، توکل، خیر و شر وغیرہ مضامین کے ذریعہ غلط مفہوم سے متنبہ کرتے ہیں۔

اس طرح اس سیاسی، مذہبی اور اقتصادی نظام کے نشیب و فراز سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ یہ دور ہر اعتبار سے خلفشار و بحران کا دور تھا۔ ہندوستان میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے زوال شروع ہوتا ہے اور سیاسی زوال کے ساتھ مذہبی اور اقتصادی زوال بھی تیز تر ہو جاتا ہے۔ صنعتی انقلاب کے اثرات، مشنریوں کی آمد اور انگریزوں کے تسلط کی وجہ سے مسلمانوں کی زندگی میں بے چینی پھیل جاتی ہے۔ مسلم قوم کے ذریعے انگریزی نظام کی خوبیوں سے مستفید ہونے کے بجائے ان سے دوری اختیار کی جاتی ہے اور ان کے کمزور عقائد ہونے کی وجہ سے صرف تقلید پر قانع ہونے لگتے ہیں۔ ایسی صورت میں کچھ مفکرین اسلام اور مصلحین اس زبوں حالی سے نکالنے کا بیڑا اٹھاتے ہیں اور مختلف تحریکیں وجود میں آتی ہیں جن میں سب سے زبردست تحریک سر سید احمد کی تحریک تھی اور حالی اس تحریک کے ایک عظیم علمبردار تھے۔

حالی کے عہد کا عالمی مسلم معاشرہ

مسدس حالی میں حالی نے نہ صرف ہندوستان کے زوال کے اسباب بیان کیے ہیں بلکہ مسلمانوں کی تاریخ پر بھی عمیق نظر ڈالی ہے۔ اور ترقی مسلمین کے ان اوصاف کا ذکر کیا ہے جو اس زمانے میں مفقود نظر آتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اسلامی تاریخ کے عروج وزوال اور عالمی مسلم معاشرہ پر نظر ڈالی جائے۔

اٹھارہویں صدی سے قبل کی اسلامی تاریخ ترقی و عروج کی تاریخ ہے۔ خلفائے راشدین کے بعد اسلام کی توسیع و ترقی اور اشاعت تیرہویں اور چودہویں صدی میں ہوئی۔ اسی زمانے میں منگولوں (۱) نے اسلام قبول کیا اور مسلمانوں کے اثرات سائبرس سے روس اور وسط یورپ تک پھیلے۔ اسی زمانے میں اسلام افریقہ کے صحرائے اعظم اور اس کے جنوبی علاقے میں پھیلا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں پورا برصغیر ہندوپاک مسلمانوں کے زیر اقتدار آیا اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں ملائشیا اور انڈونیشیا کے وسیع و عریض خطے میں اسلام پھیلا۔ (۲) یہ عہد نہ صرف اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں مسلمان سیاسی میدان میں نقطہ عروج پر پہونچ گئے تھے بلکہ یہ دور اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس دور میں اشاعتِ اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقِ حسنہ کی وجہ سے لوگ اسلام قبول کرنے لگے۔ اس دور میں ہر طرح کی کتابیں لکھی جانے لگیں۔ مثلاً مذہبی، اقتصادی، بحری، جغرافیائی اور سائنسی وغیرہ۔

سترہویں صدی تک مسلمان ترقی کے قابلِ رشک منازل طے کر چکے تھے۔ اس دور تک اسلامی طاقت مضبوط و مستحکم ہو چکی تھی اور دنیا کی بڑی طاقت بن چکی تھی اور تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے مراکز انہی حکومتوں کے زیر سائے پھل پھول رہے تھے۔ اسلامی سلطنت کی وسعت مشرق میں انڈونیشیا سے لے کر مغرب میں بحر اوقیانوس کے ساحل تک اور شمال میں ہنگری سے لے کر جنوب میں راس کماری اور غانہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہندوستان میں تیموری،

---

(۱) منگول وہی ہیں جنہوں نے ۱۲۵۸ء میں شاہ خوارزم کو شکست دے کر اسلامی آبادی کو آگ اور خون کی بازیگاہ بنادیا تھا اور بغداد کی عظیم لائبریری کو جلادیا تھا۔ سمرقند، بخارا، نیشاپور، بلخ، ہرات، اصفہان اور تمام دوسرے بڑے شہروں کو کھنڈر بنادیا تھا۔

(۲) تفصیل کے لیے ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ حصہ دوم، ثروت صولت کا مطالعہ کریں۔

ایران میں صفوی، بغداد میں عثمانی سلطنت (جو مراکش سے سوڈان تک پھیلی ہوئی تھی) اور فلالی ان چار بڑی حکومتوں میں اسلامی دنیا تقسیم ہو چکی تھی۔ جس کی وجہ سے چاروں طرف امن وامان قائم تھا، زراعت، صنعت وحرفت، تجارت اور علوم وفنون ترقی پر تھے۔ شاہ عبدالحق، مجدد الف ثانی اور حاجی خلیفہ جیسے اہل علم، شمس الدین محمد فتاری، کمال پاشازادہ، ابراہیم حلیبی، ابو سعود آفندی، حاجی بیرم وی، بدرالدین ابن قاضی، علوم حکمت اور جغرافیہ میں، قاضی زادہ رومی، علی کوشجو کی، ریاضی میں، حاجی پاشا طب میں، پیری رئیس سمندری علوم میں اپنی صلاحیتیں اور قابلیتوں سے اسلامی سلطنت کو مالامال کررہے تھے۔ امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم جیسے مدبر اور جید عالم دین اسی دور میں پیدا ہوئے تھے اور فنِ تعمیر میں اصفہانی عمارتیں، قرطبہ کی جامع مسجد، لاہور اور کشمیر کے باغات اسی دور کے نشانات ہیں۔

ان مسلمانوں کی ترقی کا راز ان کا ایمانی جوش وخروش تھا۔ انہوں نے دین کی اشاعت اور ترقی کے لیے ہر میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیا۔ شہر بسایا، تہذیب وتمدن سکھایا۔ طب میں، جغرافیہ میں، سائنس میں ہر میدان میں کمال علم کو پہنچے۔ عربی زبان ہر جگہ چھائی ہوئی تھی۔ امام غزالی، بو علی سینا، رازی، طبری جیسے اہل علم گذرے۔ پوری اسلامی دنیا میں ایک ربط اور ایک تعلق قائم تھا، ان سب کا ایک ہی مقصد تھا، ایک ہی فکر تھی کہ اسلام اپنے کمال وجمال سے از سر نو متعارف ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی محنت وکوشش سے اسلام کو بام عروج تک پہنچایا اور بعد کے مسلمان صرف ان کی تقلید پر قانع ہو گئے اور تجدید واجتہاد سے فرار اختیار کرنے لگے۔ جس کی وجہ سے عقلی جمود تاری ہو گیا اور یہ بات ان کے ذہن میں رچ بس گئی کہ ہم اپنے اسلاف کی تقلید سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ان کا مقابلہ کرنا بہت بڑی بات ہے۔ چنانچہ اس علمی اور ذہنی جمود نے مسلمانوں کی ترقی کے راستے بند کر دیئے۔

مسلمانوں کے کارنامے کے متعلق ثروت صولت رقمطراز ہیں :

> ”سقوط بغداد کے بعد علم امراض چشم میں آخر بڑا اضافہ کمال الدین کمال نے کیا۔ اندلس میں متعدی امراض سے متعلق ابن خطیب (۱۳۱۳ء سے ۱۳۷۴ء) اور گردش خون سے متعلق ابن نفیس (۱۲۰۰ء سے ۱۲۸۸ء) کی تحقیقات، علم طب میں مسلمانوں کے آخری بڑے اضافے ہیں اسی طرح ارسطو کی منطق پر ابن تیمیہ (۱۲۶۳ء سے ۱۳۲۸ء) کی اجتہادی انداز میں تنقید اور فلسفہ تاریخ اور فلسفہ اجتماعیات کی ابن خلدون کے مقدمے میں وضاحت فکری میدان میں مسلمانوں کے آخری اضافے ہیں۔ ابن ماجد آخری مسلمان جہاز راں ہیں۔ ان کے آلاتِ جہاز رانی یورپ کے جہاز رانوں سے بہتر تھے۔ سقوط بغداد کے بعد ابن بطوطہ (۱۳۰۴ء سے ۱۳۷۷ء) اور اولیاء حلبی (۱۶۱۲ء سے ۱۶۷۹ء) کے علاوہ اسلامی دنیا میں کوئی منچلا سیاح پیدا نہیں ہوا۔ پندرہویں صدی میں مسلمان قطب

نما سے واقف ہو چکے تھے۔ لیکن وہ اس سے یورپ کے جہاز رانوں کی طرح فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ بارود اور آتشین اسلحہ کے استعمال کرنے والی قوموں میں مسلمان یقینی طور پر پہلی قوم تھی۔ لیکن ۱۴۵۲ء میں فتح قسطنطنیہ کے موقع پر اور سولہویں صدی کے وسط میں دکن میں مسلمانوں نے جو بڑی اور بھاری توپیں استعمال کیں اس کے بعد وہ اسلحہ سازی کی صنعت میں کوئی اضافہ نہیں کر سکے۔"(۴۶)

لیکن مسلمانوں کا یہ عروج سیاسی اور تمدنی لحاظ سے تھا۔ اخلاقی و علمی لحاظ سے مسلمان زوال کی طرف جا رہے تھے۔ یہ زوال تباہیٔ بغداد کے بعد تیزی سے شروع ہو گیا تھا اور سترہویں صدی تک آتے آتے مسلمان علمی، اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے زوال پذیر ہو گئے۔ سیاسی اعتبار سے ایک ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ مسلمانوں کا رعب، ڈر اور خوف لوگوں کے دلوں میں تھا لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ سلطنت عثمانیہ رقبہ کے لحاظ سے مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت تھی لیکن اعمال کے اعتبار سے اپنی حمیت کھو چکی تھی، برائیاں ان کے یہاں پیدا ہو گئی تھیں، بد دیانتی، رشوت خوری عام ہو گئی تھی، فوج آرام طلبی کا شکار ہو چکی تھی، امراء اپنی رعایا پر ظلم کرنے لگے تھے اور نہ صرف سلطنت عثمانیہ میں برائیاں عام تھیں بلکہ تیموری سلطنت میں دولت کی فراوانی نے مسلمانوں کی بہادری اور شجاعت کو ختم کر دیا تھا، آرام طلبی و عیش و پسندی، بہادری اور مشکل پسندی کی جگہ گھر کر گئی تھی۔ کاہلی، بے ایمانی، بد دیانتی اور چوری عام ہو گئی تھیں۔ بقول تاراچند :

"انیسویں صدی میں تمام دنیا کی مسلم حکومتیں یورپ، افریقہ اور ایشیا میں الٹ پلٹ گئیں۔ برطانیہ، فرانس اور روس کی باہمی رقابتیں اور ملوکیتیوں کی توسیع پسندیاں مسلم ملک کی پریشانیوں کے لیے خاص طور پر ذمہ دار ہیں۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ ان کی اندرونی کمزوریوں اور حماقتوں نے مغربی طاقتوں کو مداخلت اور جہاں جہاں ممکن تھا ان کے اختیارات چھین لینے کے مواقع فراہم کیے۔"(۴۷)

ثروت صولت مسلمانوں کے زوال کے اسباب بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

"اسلامی دنیا میں فکری اور علمی جمود کے اور مسلمانوں کے زوال کے متعدد اسباب ہیں۔ ایک سبب تو یہ تھا کہ اسلامی دنیا کی تین سب سے بڑی قومیں عرب، ایران اور ترک ایک ہزار سال تک محیر العقول کارنامے انجام دینے کے بعد اپنی توانائیاں ختم کر چکی تھیں اور وہ عزم و حوصلے جو نئی قوموں کی خصوصیات ہوتی ہیں محروم ہو چکی تھیں۔

مسلمانوں کے زوال کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اب ان کے سامنے کوئی اعلیٰ نصب العین باقی نہیں رہا تھا۔ قرون اولیٰ کے مسلمان غلبۂ اسلام کے نصب العین میں سرشار تھے اور وہ دنیا کی نجات کے لیے

اسلامی انقلاب کو ایک لازمی چیز سمجھتے تھے۔ ملوکیت کے زیر اثر مسلمانوں کا یہ اسلامی نصب العین کمزور ہوتا چلا گیا اور ایک وقت وہ آگیا کہ مسلمان حکمرانوں کے ذہن سے یہ نصب العین بالکل محو ہوگیا اور اسلام دوسرے مذاہب کی طرح رسمی مذہب بن گیا۔"(۴۸)

تاریخی اعتبار سے مسلمانوں کا زوال اٹھارہویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۷۹۹ء میں عثمانی سلطنت کی کارلووٹنر کی جنگ میں شکست سے ہوئی اور عثمانیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات ہوئی تو ہندوپاک میں زوال ہوا۔ ۱۷۲۷ء میں سلطان اسمٰعیل کے انتقال پر مراکش کمزور ہوگیا۔ ثروت صولت بیان فرماتے ہیں کہ :

مسلمانوں کے سیاسی زوال کی کسی ایک تاریخ کا تعین کرنا مشکل ہے۔ ۱۶۸۲ء میں ویانا کے محاصرے میں ترکوں کو ناکامی ہوئی۔ ۱۶۸۷ء میں مہاکز کی دوسری جنگ میں شکست کے نتیجہ میں ہنگری ترکوں کو اپنی ان ناکامیوں کو تسلیم کرنا پڑا اور وہ پہلی مرتبہ اپنے علاقوں سے دست بردار ہونے پر مجبور ہوئے۔ مشرقِ بعید میں بھی سترہویں صدی کے آخری حصے میں مسلمانوں کو یوروپی اقوام کے حملوں کے مقابلے میں مسلسل ناکامیاں ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ جاوا میں ۱۶۷۷ء میں اور سماترا پر اور ۱۶۸۳ء میں بانتن پر ولندیزی، بالادستی قائم ہوگئی تھی۔ سماترا میں پڈانگ پر ۱۶۸۱ء میں ولندیزی قابض ہو چکے تھے۔ لیکن اس کے برخلاف اسلامی دنیا کے وسطی حصے میں اور مغرب اقصیٰ میں مسلمانوں کو ۱۷۰۰ء کے بعد بھی یورپ اور غیر مسلم طاقتوں کے مقابلے میں کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ مراکش میں ۱۷۲۷ء میں مولانا اسمٰعیل کی وفات تک مسلمان بیرونی حملوں کو کامیابی سے پسپا کرتے رہے۔ مشرقی افریقہ کے ساحل سے ۱۶۹۸ء میں عربوں نے پرتگالی اقتدار کو ختم کردیا۔ ایران میں ۱۷۳۵ء نادر شاہ نے زار روس کی حکومت کو ایرانی مقبوضات چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ ہندوستان میں مرہٹوں کو اس کے بعد کامیابیاں حاصل شروع ہوئیں۔ لہذا ان مختلف تاریخوں کے پیش نظر ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالم گیر کے سال وفات کو اسلامی دنیا کے زوال کی تاریخ مقرر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔"(۴۹)

ایک طرف ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور مسلمان عروج سے زوال کی طرف آرہے تھے تو دوسری طرف یورپ کے ممالک عروج سے زوال کی جانب سفر طے کررہے تھے۔ مسلمانوں کے اوصاف اب یورپ کے اندر داخل ہوگئے۔ علم وادب، جد وجہد اب انگریزوں اور اہل یورپ والوں کا شیوہ بن گیا تھا۔ جس وقت مسلمان عروج پر تھے اور تہذیب وتمدن اور علم وفن میں لاثانی تھے اس وقت یورپ تاریکی دور سے گذر رہا تھا۔ اس لیے یہ دور یورپ کی تاریخ میں تاریک دور کہلاتا ہے۔ اہل یورپ نے مسلمانوں کی ترقی کے راز اور اسباب تلاش کیے۔ عربی زبان کی مختلف کتابوں کو اپنی

زبانوں اور لاطینی زبانوں میں ترجمہ کیا اور اسلامی علوم و فنون سے واقفیت حاصل کر کے یورپ میں نشأۃ ثانیہ اور تحریک اصلاح کا آغاز کیا اور اس طرح ان کے معاشی، سیاسی اور اخلاقی معاملات میں کافی تبدیلی آئی۔ یورپ کے عروج کے متعلق ثروت صولت تحریر فرماتے ہیں :

"یورپ کی نشأۃ ثانیہ کا آغاز اٹلی، جنوبی فرانس اور اسپین سے ہوا یہ وہ ملک تھے جو اسلامی دنیا سے قریب تھے اور جن کے مسلمانوں سے تعلقات قائم تھے۔ یورپ والوں نے مسلمانوں سے کاغذ بنانا، ہندسوں اور صفر کا استعمال سیکھا، قطب نما اور بارود بنانا بھی غالباً انہوں نے مسلمانوں سے ہی سیکھا۔ اندلس کے شہر طلیطلہ میں ۱۰۸۵ء کے دو سو سال تک عربی کتابوں کے لاطینی زبان میں ترجمہ ہوتے رہے۔ اس کے بعد ترجموں کا یہ سلسلہ صقلیہ، اٹلی اور جنوبی فرانس تک پھیل گیا۔ اطالوی شاعر دانتے (۱۲۲۱ء۔ ۱۲۶۵ء) کی کتاب "طربیہ خداوندی" اور سپانوی ادیب سر دانتے کی کتاب "دان کوتک زوت" کو پوری ادب کے اخبار میں بنیادی مقام حاصل ہے۔ لیکن یہ دونوں کتابیں مسلمان مصنفین کے زیر اثر لکھی گئیں تھیں۔"(۵۰)

ایک یورپی مصنف کا خیال ہے کہ :

"یورپ کی نشأۃ ثانیہ پر مسلمانوں کا جو اثر پڑا اب اہل یورپ اس کا کھل کر اعتراف کرنے لگے ہیں۔"(۵۱)

مسلمانوں کی تنزلی اور یورپ کی ترقی کے بارے میں ثروت صولت کا بیان ہے :

"ادھر یورپ کی ترقی شروع ہوئی اور ادھر اسلامی تاریخ کا دوسرا دور شروع ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کی علمی ترقی رک گئی تھی۔ وہ صرف اچھی عمارتیں بنانا اور مصوری کرنا جانتے تھے لیکن ریاضی، طب، جغرافیہ اور سائنس سے متعلق علوم بھولتے جا رہے تھے اس کے برخلاف یورپ علمی ترقی کر رہا تھا یا فلسفہ، سائنس، ریاضی اور جغرافیہ میں نئی کتابیں لکھی جا رہی تھیں اور یورپ کے سیاح دور دور کے ملکوں کے سفر کر رہے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ سلیمان اعظم اور احمد کوپریلی کے زمانے میں یورپ اتنا ترقی یافتہ ہو گیا کہ اس کا مقابلہ کرنا مشکل ہو گیا۔ یورپ کی فوجوں کے پاس ایسے ایسے ہتھیار ہو گئے جو مسلمانوں کے پاس نہیں تھے اور ان کی فوجیں بہت منظم ہو گئیں۔"(۵۲)

اس تاریخ کے عروج و زوال کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ لگانا آسان ہو جائے گا کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب کیا تھے اور یورپ کی ترقی کا راز کیا تھا؟ ایک طرف مسلمان اپنی سلطنت کو قائم و دائم رکھنے میں علوم و فنون کو فراموش کرنے لگے جس کی بدولت ان کو ریاستیں ملیں اور انہوں نے دنیا کو تہذیب و تمدن سکھایا تو دوسری طرف ان

مسلمانوں کی علم فراموشی (۱) کو غنیمت پاکر اہل یورپ نے اس کو اپنا مشغلہ بنایا اور علم و فن کے ہر میدان میں اپنا پیر جمانا شروع کر دیا۔ فلسفہ، سائنس، جغرافیہ، ریاضی اور سیاحی اب ان کے ہاتھ آنے لگے اور یہ دور دور تک سفر کرنے لگے کولمبس، واسکوڈی گاما، ایمیرگو اور بلبوا جیسے سیاح پیدا ہوئے۔ اسپینگ، ارچینی، ریچرڈس، آرک رائیٹ، سمول کرو میئر وغیرہ نے نئی نئی ایجادات سے سماج میں حرکت پیدا کر دی۔ علم و ادب کی وجہ سے لوگوں میں حقوق و انصاف کا احساس پیدا ہو گیا۔ صنعت و حرفت کی ترقی سے عوام کی اہمیت بڑھتی چلی گئی۔ اس طرح ایک جدید سماج ابھر کر سامنے آیا اور نئے مسائل در پیش ہوئے۔ رفتہ رفتہ عوام کے ہاتھوں میں طاقت آنے لگی اور بادشاہیت ختم ہونے لگی نتیجہ میں جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرزم وغیرہ نظام قائم ہونے لگے۔

(۱) ۱۰۷۰ء سے ۱۵۰۰ء تک عربی کتابوں کے ترجمہ ہوتے رہے۔ ان ترجموں کے مراکز سلرنو، طلیطلہ (اندلس) اور جزیرہ صقلیہ اہم ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱.	حالی کی کہانی حالی کی زبانی	مسدس حالی	ص : ۵
۲.	حالی کی کہانی حالی کی زبانی	مسدس حالی	ص : ۵
۳.	حالی کی کہانی حالی کی زبانی	مسدس حالی	ص : ۷
۴.	حالی کی کہانی حالی کی زبانی	مسدس حالی	ص : ۷
۵.	حالی کی کہانی حالی کی زبانی	مسدس حالی	ص : ۷
۶.	حالی	مالک رام	ص : ۱۶
۷.	حالی	مالک رام	ص : ۲۲
۸.	حالی	مالک رام	ص : ۲۶
۹.	یادگار حالی	صالحہ عابد حسین	ص : ۲۹
۱۰.	یادگار حالی	صالحہ عابد حسین	ص : ۲۹
۱۱.	یادگار حالی	صالحہ عابد حسین	ص : ۵۰
۱۲.	یادگار حالی	صالحہ عابد حسین	ص : ۵۱
۱۳.	یادگار حالی	صالحہ عابد حسین	ص : ۵۲
۱۴.	یادگار حالی	صالحہ عابد حسین	ص : ۵۲
۱۵.	حالی	مالک رام	ص : ۲۷
۱۶.	حالی	مالک رام	ص : ۳۰
۱۷.	یادگار حالی	صالحہ عابد حسین	ص : ۲۳۶
۱۸.	یادگار غالب	حالی	ص : ۱۳
۱۹.	حالی	مالک رام	ص : ۷۶

۲۰.	حالی	مالک رام	ص: ۷۹
۲۱.	حالی کی کہانی حالی کی زبانی		ص: ۱۳
۲۲.	تاریخ تحریک آزادی ہند جلد اول	تاراچند	ص: ۷۴
۲۳.	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد دوم	ثروت صولت	ص: ۳۶۷
۲۴.	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد دوم	ثروت صولت	ص: ۳۶۷
۲۵.	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد دوم	ثروت صولت	ص: ۳۸۸
۲۶.	تاریخ تحریک آزادی ہند جلد اول	تاراچند	ص: ۳۹۱
۲۷.	تاریخ تحریک آزادی ہند جلد اول	تاراچند	ص: ۵۴۷
۲۸.	سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء	سید عبداللہ	ص: ۲۶
۲۹.	تاریخ تحریک آزادی ہند جلد اول	تاراچند	ص: ۳۹۰
۳۰.	تاریخ تحریک آزادی ہند جلد اول	تاراچند	ص: ۳۹۰
۳۱.	حیاتِ جاوید	حالی	ص: ۴۱۶
۳۲.	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد دوم	ثروت صولت	ص: ۳۹۷
۳۳.	حالی کا سیاسی شعور	معین حسن جذبی	ص: ۳۷
۳۴.	حالی کا سیاسی شعور	معین حسن جذبی	ص: ۴۰
۳۵.	حیاتِ جاوید	حالی	ص: ۳۶۰
۳۶.	سر سید اور ان کے نامور رفقاء	سید عبداللہ	ص: ۳۳
۳۷.	حیاتِ جاوید	حالی	ص: ۳۰۸
۳۸.	حالی کا سیاسی شعور	معین حسن جذبی	ص: ۵۶
۳۹.	حالی کا سیاسی شعور	معین حسن جذبی	ص: ۴۶
۴۰.	سر سید اور ان کے نامور رفقاء	سید عبداللہ	ص: ۸۶
۴۱.	سر سید اور ان کے نامور رفقاء	سید عبداللہ	ص: ۸۹
۴۲.	سر سید اور ان کے نامور رفقاء	سید عبداللہ	ص: ۸۷

۴۳. سر سید اور ان کے نامور رفقاء — سید عبداللہ — ص: ۹۰

۴۴. سر سید اور ان کے نامور رفقاء — سید عبداللہ — ص: ۹۰

۴۵. شبلی — ظفر احمد صدیقی — ص: ۲۵

۴۶. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد دوم — ثروت صولت — ص: ۳۵۷

۴۷. تاریخ تحریک آزادی ہند جلد سوم — تاراچند — ص: ۴۷۔۵۴۵

۴۸. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد دوم — ثروت صولت — ص: ۳۵۸

۴۹. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد دوم — ثروت صولت — ص: ۳۵۱

۵۰. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد دوم — ثروت صولت — ص: ۳۶۰

۵۱. موسیو رینا ابن رشید فلسفہ ابن رشید اردو ترجمہ جامعہ عثمانیہ — ص: ۳۰۶

۵۲. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد دوم — ثروت صولت — ص: ۳۶۱

باب دوم

حالی کا تاریخی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی شعور

سماجیاتی مطالعہ کے سلسلے میں ادب اور سماجی رشتوں کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ ادب خلاء کی پیداوار نہیں ہوتا بلکہ اس کی تخلیق میں سماج اور سماجی عوامل کار فرما ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ادب کو سماج کے رشتوں اور سماج کو ادب کے وسیلے سے جانچا اور پرکھا جائے۔ چونکہ ادب کا تعلق لازمی طور پر فن کار کی شخصیت سے ہوتا ہے اور فن کار کا تعلق کسی سماج سے۔ اس لیے ادب کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے کہ ادیب کی شخصیت کا بھی مطالعہ کیا جائے اور ادیب کی شخصیت کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے کہ ادیب کے سماج اور اس کے عہد کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ اس باب میں یہی موضوع زیر بحث ہے کہ حالی کے مسدس میں کون کون سے عوامل کار فرما ہیں جنھوں نے حالی کے سماجی، تاریخی، سیاسی اور مذہبی و تہذیبی شعور کو تشکیل دیا اور اسے ایک مخصوص سمت عطا کی۔

ادب کے سماجیاتی مطالعے پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر محمد حسن صاحب فرماتے ہیں :

> "وہ (ادبی سماجیات) تخلیق کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کو بھی زیر مطالعہ لاتی ہے۔ وہ شاعروں اور ادیبوں کے پیشے، ان کے طبقے، ان کے دیہی اور شہری رشتے اور ان کی زندگی کے رنگ ڈھنگ ہی نہیں بلکہ عوام کے ذہنوں میں ان کی تصویر کو بھی زیر بحث لاتی ہے۔ اور ان سے دور رس نتیجے نکالتی ہے۔ جو ادب اور سماج دونوں کے مطالعے کے سلسلے میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔" (۱)

اس ضمن میں یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ مصنف کا مخاطب کون ہے یعنی وہ کس کے لیے اور کیوں لکھ رہا ہے ؟ یہ تمام باتیں اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

گذشتہ باب میں حالی کی شخصیت اور ان کی خدمات کے حوالے سے حالی کے عہد پر بات ہو چکی ہے۔ اس لیے اس باب میں عصری عوامل کے واسطے سے حالی کے شعور کا مطالعہ کرنا ہے۔

مسدس کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوگا کہ حالی کو اسلامی تاریخ سے خاصی دلچسپی تھی۔ جب وہ مسلمانوں کے عروج کا بیان کرتے ہیں تو ان کی نگاہ ان باریکیوں سے گزرتی ہے جس پر ہر کسی کی نگاہ کا گزر محال ہے۔ مثلاً جب وہ اسلامی تاریخ کے روشن دور کا بیان کرتے ہیں تو یوں رطب اللسان ہیں۔

لیے علم و فن ان سے نصرانیوں نے　　کیا کسب اخلاق روحانیوں نے
ادب ان سے سیکھا صفاہانیوں نے　　کہا پڑھ کے لبیک یزوانیوں نے
ہر ایک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

ارسطو کے مردہ فنوں کو جلایا　　فلاطوں کو پھر زندہ کرکے دکھایا
ہر اک شہر و قریہ کو یوناں بنایا　　مزہ علم و حکمت کا سب کو چکھایا
کیا ہر طرف پردہ چشم جہاں سے
جگایا زمانے کو خواب گراں سے

ہر اک مے کدے سے بھرا جاکے ساغر　　ہر اک گھاٹ سے آئے سیراب ہوکر
گرے مثل پروانہ ہر روشنی پر　　گرہ میں لیا باندھ حکم پیغمبرؐ
کہ حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

ہر اک علم کے فن کے جویا ہوئے وہ　　ہر اک کام میں سب سے بالا ہوئے وہ
فلاحت میں بے مثل و یکتا ہوئے وہ　　سیاحت میں مشہور دنیا ہوئے وہ
ہر اک ملک میں ان کی پھیلی عمارت
ہر اک قوم نے ان سے سیکھی تجارت(۲)

یہ امر قابل ذکر ہے کہ حالی جب تاریخ کی وضاحت کرتے ہیں تو ان تمام گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں جن سے کسی قوم کی تاریخ بنتی یا بگڑتی ہے۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ وہ تاریخ کا بیان کیوں کرتے ہیں؟ اور وہ تاریخ کی روشنی میں کس بات کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں؟ تو یہ احساس ہوگا کہ حالی اصلاً مصلح تھے وہ مسلمانوں کی اصلاح و بہبودی چاہتے تھے ۔اس لیے وہ اپنے خیالات کو نثر میں وضاحت کے ساتھ اور نظم میں تاثیر کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور تاریخ کے نشیب

وفراز سے دور جدید کے مسلمانوں کو آگاہ کرانا چاہتے ہیں کہ اگر زمانے کا ساتھ نہ دیا جائے تو زمانہ بغیر انتظار کے آگے نکل جاتا ہے اور وہی لوگ ترقی کر پاتے ہیں جو زمانے کی نازک مزاجی کو سمجھتے ہیں۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :

جو لوگ زمانے کی پیروی نہیں کرتے وہ گویا زمانے کو اپنا پیرو بنانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ ان کی سخت خام خیالی ہے۔ چند مچھلیاں دریا کے بہاؤ کو نہیں روک سکتیں اور چند جھاڑیاں ہوا کا رخ نہیں پھیر سکتیں۔

اسی لیے ایک پختہ کار شاعر نے کہا ہے : ؎

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

اور عرب کے ایک حکیم کا قول ہے کہ "در مع الدھر کیف مادار" (یعنی جدھر کو زمانہ پھرے اس کے ساتھ پھر جاؤ) شیخ اکبر فرماتے ہیں صرھیو لا لکل صورۃ (یعنی اپنی ذات میں ایسی قابلیت پیدا کرو کہ جس رنگ کو چاہے فوراً قبول کر لے) یہ اس لیے فرمایا کرتے کہ زمانہ کبھی انقلاب سے خالی نہیں رہتا اس کا مقابلہ انسانِ ضعیف البنیان سے نہیں ہو سکتا۔ پس انسان میں ایسی قابلیت ہونی ضروری ہے کہ جیسی ضرورت دیکھے ویسا بن جائے تاکہ زمانے کا کوئی انقلاب اس کو سخت صدمہ نہ پہونچائے۔ آندھی کے پرزور حملے انہیں تناور درختوں کو نقصان پہنچاتے ہیں جو اپنی جگہ سے ٹلنا نہیں چاہتے پر چھوٹے چھوٹے لچکدار پورے جو ہوا کے ہر جھوکے کے ساتھ جھک جاتے ہیں ہمیشہ برقرار رہتے ہیں۔" (۳)

حالی اس دور میں پیدا ہوئے جس دور میں ظلم و ستم کی آندھی اپنی پوری رفتار کے ساتھ اس اسلامی عمارت کو منہدم کرنے کی کوشش میں تھی جس عمارت کو اسلاف نے جانفشانی اور جگر سوزی سے تعمیر کیا تھا اور اسلامی عقائد و مسائل پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں ہو رہی تھیں۔ ایسے دور میں حالی مسلمانوں کو ان تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے اسلاف زمانے کی رفتار اور اس کے مزاج سے آشنا تھے اس لیے انہوں نے ترقی کے منازل طے کیے۔ اگر ہم ان کی تقلید کریں گے تبھی ہم ان کی طرح ترقی کر سکتے ہیں۔ وہ علم و فن کے معاملے میں بہت چاک و چوبند تھے اور اسلام کی روح سے واقف تھے اس لیے کہیں بھی ان کو علم ملتا اسے وہ فوراً قبول کر لیتے۔ حالی تاریخی شواہد کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "دنیا کی بہبودی یا دین کی کامیابی مقتضائے وقت کی موافقت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

مگر اس موافقت سے ہماری یہ مراد ہرگز نہیں کہ مثلاً بے دینی اور الحاد کے زمانے میں دین و مذہب سے ہاتھ اٹھا بیٹھیں اور عیش و عشرت کے زمانے میں جفاکشی اور محنت سے دست بردار ہو جائیں یا جہاں خوشامد کا بازار گرم ہو وہاں خوش آمدی بن جائے او جہاں مسخرہ پن کا زور ہو وہاں غیرت اور حمیت کو بالائے طاق رکھ دیں نہیں بلکہ ہماری رائے میں

کوئی برے سے برا زمانہ ایسا نہیں ہوتا جس میں مقتضائے وقت کے موافق کوئی نہ کوئی جائز طریقہ کامیابی کا موجود نہ ہو۔"(۴)

اور بیان کرتے کرتے ان کی تحریر میں تقریر کا جوش پیدا ہو جاتا ہے اور خطابانہ انداز میں تحریر کرتے ہیں۔

"اے ہندوستان کے مسلمانوں! کیا تم ابھی اسی عالم میں ہو جس میں تمہارے آباواجداد زندگی بسر کر گئے ہیں؟ اور کیا تم اسی کھیتی کے پروان چڑھنے کے منتظر ہو جس میں تمہارے بزرگوں نے تخم افشانی کی تھی؟ مدت ہوئی کہ وہ عالم گزر گیا اور وہ کھیتی برباد ہو گئی۔ ذرا آنکھیں کھولو اور دیکھو کہ تم کون ہو؟ اور کہاں ہو؟ تمہارے گرہ میں جو دام ہے وہ بازار میں آج پھوٹی کوڑی کو نہیں چلتے تمہارے کان میں جو بال ہے اسے کوئی مفت بھی لینا نہیں چاہتا۔ تمہارے چراغ میں جو تیل تھا وہ جل گیا اور تمہاری کھیتی میں جو پانی تھا وہ سوکھ گیا۔ دیکھو تمہاری ناؤ بودی ہے اور دریا دم بدم چڑھتا جاتا ہے۔ تمہارے قافلہ پیادہ ہے اور منزلیں کٹھن آتی جاتی ہیں۔"(۵)

حالی اصلاً مصلح تھے وہ قوم کی زبوں حالی کو دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ وہ انگریزی تعلیم کے کلیتاً حامی نہیں تھے اور نہ ہی اسلام کو وہ ترقی کے راہ میں مانع سمجھتے تھے بلکہ وہ مسلمانوں کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ جمود کی جو کیفیت مسلمانوں پر طاری تھی۔ اس کو توڑنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کو متحرک بنانا چاہتے تھے وہ زمانے کی رفتار سے انہیں باور کرانا چاہتے تھے۔ اور زمانے کے ساتھ چلنا سیکھاتے تھے اس لیے اس طویل تقریر کے بعد آگے تحریر کرتے ہیں کہ :

اس تمہید سے ناظرین کو یہ ضرور خیال پیدا ہو گا کہ ہم آگے چل کر اپنی قوم کو انگریزی پڑھنے، میز کرسی لگانے، کوٹ پتلون پہننے اور چھری کانٹے سے کھانے کی ترغیب دیں گے کیونکہ ظاہراً زمانہ حال کا مقتضا یہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کو یاد رہے کہ ہماری مراد اس تمہید سے ہرگز نہیں ہے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ جس بری حالت میں ہیں اس سے نکلنے کی جو سیدھی راہ انہیں نظر آئے اسی راہ کو اختیار کریں اور جس طرح ہو سکے اپنا قدم آگے بڑھائیں کیونکہ زمانہ بآواز بلند کر رہا ہے۔ "من استولی یوماہ ھو مغبون" یعنی جس کے دو دن ایک حالت پر گزریں وہ خسارہ میں رہا اور در و دیوار سے یہ صدا آ رہی ہے کہ : "یا قدم آگے بڑھاؤ ورنہ لو راہ عدم"(۶)

زمانہ کے تغیر پر حالی کا ایک مضمون ہی ہے کہ "زمانہ" جب زمانہ بدلے تم بھی بدل جاؤ۔

حالی کا تاریخی شعور اتنا پختہ تھا کہ جب وہ دور جاہلیت کی تاریخ کو بیان کرتے ہیں تو ان کی نگاہ جزئیات تک پہونچ جاتی ہے ایک ایک چیز کو وہ اشعار میں بند کر دیتے ہیں اور تاریخی واقعات بیان کرتے ہوئے ان تمام عناصر کو پیش کرتے ہیں جن سے کسی قوم کی تاریخ عروج و زوال کی منزل طے کرتی ہے۔ مسدس میں وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ اس میں

تاریخی واقعات ہیں یا قرآن وحدیث کا ترجمہ۔ دور جاہلیت کے بیان میں وہ جن نکات کو پیش کرتے ہیں ملاحظہ فرمایئے :

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا　　جہاں سے الگ ایک جزیرہ نما تھا
زمانے سے پیوند جس کا جدا تھا　　نہ کشور ستاں تھا نہ کشور کشا تھا
تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایہ
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا

نہ آب و ہوا ایسی روح پرور　　کہ قابل ہی پیدا ہوں خود جس سے جوہر
نہ کچھ ایسے سامان تھے واں میسر　　کنول جس سے کھل جاتے دل کے سراسر
نہ سبزہ تھا صحرا میں پیدا نہ پانی
فقط آب باراں یہ تھی زندگانی

زمیں سنگلاخ اور ہوا آتش افشاں　　لوؤں کی لپٹ باد صرصر کے طوفاں
پہاڑ اور ٹیلے سراب اور بیاباں　　کھجوروں کے جھنڈ اور خار مغیلاں
نہ کھیتوں میں غلہ نہ جنگل میں کھیتی
عرب اور کل کائنات اس کی یہ تھی

ان اشعار میں حالی عرب کا جغرافیہ اور اس کے طبیعاتی حالات بیان کرتے ہیں کہ عرب کیا تھا؟ اس وقت اس کی وقعت سوائے ایک ایسا جزیرہ کے کچھ نہ تھا جس پر مہذب قوم بھی حکومت کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ (لیکن اسی عرب نے دنیا کو تہذیب کا درس دیا) اور وہاں کی آب و ہوا بھی ایسی نہ تھی جس کی بنیاد پر کوئی تحریک وجود میں آتی اور تمام خرابیاں معدوم ہو جاتیں یہ بھی ظاہراً ممکن نہ تھا (جیسا کہ یورپ میں صنعتی انقلاب کی وجہ وہاں کی معدنیات تھیں۔)

پھر آگے لکھتے ہیں کہ :

نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی　　نہ یونان کے علم و فن کی خبر تھی
وہی اپنی فطرت پہ طبع بشر تھی　　خدا کی زمیں بن جنی سر بسر تھی
پہاڑ اور صحرا میں ڈیرا تھا سب کا
تلے آسماں کے بسیرا تھا سب کا

کہیں آگ پجتی تھی واں بے محابا　　کہیں تھا کواکب پرستی کا چرچا

بہت سے تھے تثلیث پر دل سے شیدا　　بتوں کا عمل سو بہ سو جابجا تھا

کرشموں کے راہب تھا صید کوئی

طلسموں میں کاہن کے تھا قید کوئی

ایسی سنگلاخ زمین اور ایسی سخت آب و ہوا اور ایسے بے خبر لوگ کہ مصر اور یونان ترقی کے منازل طے کر رہے تھے۔ لیکن ان کو اس سے کوئی مطلب نہیں تھا بلکہ یہ خانگی جنگ و جدل میں مصروف تھے۔ خانہ بدوشی کی زندگی گذارتے تھے نہ کوئی ترقی اور تبدیلی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ لیکن خدا کا کرنا تھا اور لوگوں کو دکھانا تھا کہ ایسی قوم بھی ترقی کر سکتی ہے۔

قبیلے قبیلے کا بت اک جدا تھا　　کسی کا ہبل تھا کسی کا صفا تھا

یہ عزّیٰ پہ وہ نائلہ پر فدا تھا　　اسی طرح گھر گھر بنا اک خدا تھا

یہاں ابر ظلمت میں تھا مہر انور

اندھیرا تھا فاران کی چوٹیوں پر

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ　　ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ

فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ　　نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ

وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے

درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے

نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اڑ بیٹھتے تھے　　سلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے

جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے　　تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے

بلند ایک ہوتا تھا گرواں شرارا

تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا

رسم و رواج اتنی بری تھی کہ ماں اپنی ہی بیٹی کو زندہ دفن کر دیتی تھی۔ اس کا حال حالی یوں بیان کرتے ہیں :

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر　　تو خوف شماتت سے بے رحم مادر

پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور　　کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جاکر

وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی

جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

جوا، شراب نوشی اور عیاشی کے ایسے دلدادہ تھے کہ ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔

جوا ان کے دن رات کی دل لگی تھی　　شراب ان کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
تعیش تھا غفلت تھی دیوانگی تھی　　غرض ہر طرح ان کی حالت بری تھی

بہت ان کو گذری تھیں صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکیوں پر تھیں بدیاں

غرض کہ عرب کے حالات کے بدلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے۔ ایسی غیر مہذب قوم اور ایسی پستی میں پڑی ہوئی قوم، بت پرستی و جہالت سے معمور تہذیب سے ناآشنا، جنگ و جدل سے محبت، بیٹی سے نفرت، عریانیت سے انسیت، عیاشی میں ماہر قوم آخر کار تہذیب کا درس دیتی ہے۔ علوم و فنون سے دنیا کو سیراب کراتی ہے۔ محبت و اخوت کی مثال بنتی ہے۔ تجارت کا سبق سیکھاتی ہے۔ وہ قوم بلند ہو گئی جو قوم پست تھی۔ وہ قوم عزیز بن گئی جو ذلیل تھی آخر یہ کیسے تبدیلی آئی۔ حالی انہی وجوہات کا بیان کر کے موجودہ مسلمانوں کو درس دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی پستی کا ذمہ دار خود مسلمان ہے اور دوسرا کوئی نہیں۔ حالی تاریخی حقائق سے مسلمانوں کو آگاہ کرا رہے ہیں کہ اگر قوم نہیں سدھری تو نہ صرف قوم تباہ ہو گئی بلکہ وہ لوگ بھی تباہ ہوں گے جو قوم کی کشتی میں سوار ہیں اور جن کو ذرا بھی قوم سے ہمدردی ہے مثلاً :

یہی حال دنیا میں اس قوم کا ہے　　بھنور میں جہاز آ کے جس کا کھڑا ہے
کنارہ ہے دور اور طوفان بپا ہے　　گماں ہے کہ ہر دم کے اب ڈوبتا ہے

نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی
بڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے　　فلاکت سما اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈا رہی ہے　　چپ و راست سے یہ صدا آ رہی ہے

کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

حالی کے سیاسی شعور کے متعلق یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ حالی سر سید کے ہم نوا اور سر سید تحریک کے اہم رکن تھے۔ بلکہ اس کو ان الفاظ میں کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں کہ سر سید نے مسلمانوں میں جس تحریک کو پھیلائی حالی

نے شعر کی زبان میں اسے عوام تک پہنچایا۔(۷)اس لیے سر سید تحریک کے اغراض و مقاصد کو بغیر سمجھے حالی کے سیاسی شعور کو سمجھنا مشکل ہے۔

حالی کی ملاقات جب سر سید سے ہوئی اور سر سید احمد نے اپنی تحریک کے اغراض و مقاصد واضح کیے تو حالی بے چین ہو گئے اور سر سید کی تحریک کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ حالی اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں :

> ''نگاہ اٹھا کر دیکھا تو دائیں بائیں آگے پیچھے ایک میدان وسیع نظر آیا جس میں بے شمار راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں اور خیال کے لیے کہیں عرصہ تنگ نہ تھا۔ جی میں آیا قدم آگے بڑھائیں اور اس میدان کی سیر کریں مگر جو قدم بیس برس تک ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور جن کی دوڑ گز دو گز میں محدود رہی ہو ان سے اس وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا اس کے سوا بیس برس کی بیکار اور نکمّی گردش میں ہاتھ پاؤں چور ہو گئے تھے اور طاقت رفتار جواب دے چکی تھی لیکن پاؤں میں چکر تھا اس لیے نچلا بیٹھنا بھی دشوار تھا چند روز اسی تردد میں یہ حال رہا کہ ایک قدم آگے بڑھتا تھا دوسرا پیچھے ہٹتا تھا۔ ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے ایک دشوار گذار راستے میں رہ نورد ہے بہت سے لوگ اس کے ساتھ چلے تھے تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں بہت سے ابھی اس کے ساتھ افتادہ خیزاں چلے جاتے ہیں مگر ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں۔ پیروں میں چھالے پڑے ہیں دم چڑھ رہا ہے چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں لیکن وہ اولوالعزم آدمی جو ان سب کا رہنما ہے اسی طرح تازہ دم ہے نہ اسے رستے کی تکان ہے نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پرواہ ہے نہ منزل کی دوری سے کچھ ہراس ہے۔ اس کی چتونوں میں غضب کا جادو بھرا ہے کہ جس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی۔(۸)

حالی کی سر سید سے ملاقات ۱۸۷۵ء میں ہوئی تھی۔(۹)اس وقت حالی کی شہرت شاعر کی حیثیت سے تھی اور وہ انجمن پنجاب کے مشاعرے میں بہت سی نظمیں پیش کر چکے تھے۔ ان نظموں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ احساس ہو گا کہ حالی ایک دردمند انسان کی حیثیت سے قوم کی بربادی کا رونا رویا ہے اور سر سید احمد خاں کی شہرت قوم کی بہی خواہ کی حیثیت سے تھی وہ نئے نظام کے بدلے ہوئے رخ کو پہچان چکے تھے۔ اس لیے قوم کی فلاح و بہبودی کے لیے ایک تحریک چلا رہے تھے۔ حالی کو اس تحریک کی خبر ہو چکی تھی۔ افسردگی و مایوسی جو بغاوت کی ناکامی ، تباہی اور سیاسی اور اقتصادی حالات کی وجہ سے مسلمانوں کے گھر گھر داخل ہو چکی تھی اس کا احساس حالی کی نظم ''نشاط امید'' میں موجود ہے۔ حالانکہ یہ نظم انجمنِ پنجاب کے مشاعرہ کے لیے لکھی گئی تھی لیکن حساس دل کی جھلک شاعری میں آہی جاتی ہے۔ حالی مسلمانوں کے رویے کے پیش نظر قوم کی خوش حالی سے حالی قطعی مایوس ہو چکے تھے کہ ایک امید کی کرن

پھوٹی (سر سید تحریک کی شکل میں) اور انگریزوں کی نگاہ غضب میں تلطف کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ یہ امید وبیم حالی کی نظم "نشاط امید" میں نظر آتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہو :

تیرے ہی دم سے کٹے جو دن تھے سخت — تیرے ہی صدقے سے ملا تاج و تخت
تیرے کرشمے میں غضب دل فریب — دل میں نہیں چھوڑتے صبر و شکیب
تجھ سے مہوس نے جو شوریٰ کیا — پھونک دیا کان میں کیا جانے کیا
ہوتا ہے نو امیدیوں کا جب ہجوم — آتی ہے حسرت کی گھٹا جھوم جھوم
لگتی ہے ہمت کی کمر ٹوٹنے — حوصلے کا لگتا ہے جی پھوٹنے

ان کی کلیات کا یہ شعر ملاحظہ ہو :

دیکھ اے امید کیجیو ہم سے نہ تو کنارا
تیرا ہی رہ گیا ہے جسے دے اک سہارا

حالی کو ڈر اس لیے تھا کہ قوم کی تباہی و بربادی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اور قوم کی حالت سے واقف تھے۔ اب قوم کے پاس کیا تھا۔ نہ دولت، نہ حکومت، نہ صنعت، نہ تجارت، نہ اخوت، نہ محبت، نہ ہمدردی، نہ قربانی سب کچھ لٹ گیا تھا۔ پنپنے کے سارے آثار مٹ چکے تھے۔ کوئی سہارا باقی نہ تھا سوائے "امید" کے۔

دراصل یہ دور سیاسی، سماجی اور مذہبی اعتبار سے بڑا اتھل پتھل کا دور تھا۔ زمانہ بہت تیزی سے تغیر پذیر تھا۔ حالی کی نگاہ ان مادی تغیرات اور مذہبی تفکرات کے بدلتے ہوئے انداز کو سمجھ چکی تھی۔ اس لیے وہ حالات کا بغور تجزیہ کرتے ہیں اور مسلمانوں کے حالات کو بدلنے کے لیے ذہن کی تشکیل کی کوشش کرتے ہیں۔ حالی کے متعلق اشفاق حسین کی رائے ہے کہ :

> "حالی نے اپنے دور کے مادی تغیرات کو شعوری طور پر سمجھ لیا تھا، آنکھیں بند کر لینے کے بجائے عقل کے ذریعہ حالات کا تجزیہ کیا ہے اور مسلم قوم کا سماجی، سیاسی اور معاشی جائزہ منطقی اور سائنٹیفک طریقے سے لیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ اپنی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے پرانے نظام یعنی جاگیر دارانہ نظام کے زوال پذیر ہونے سے ماتم پرستی نہ کریں۔ بلکہ مسلسل بدلتے ہوئے حالات کے تحت اپنے کو ڈھالنے کی کوشش کرنا چاہئے کیونکہ اسی میں ان کی مادی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔" (۱۰)

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلوں کی طاقت کمزور ہوتی گئی۔ نادر شاہی حملے نے دہلی حکومت کی بچی کھچی طاقت بھی ختم کر دی۔ احمد شاہ نے دہلی کا خزانہ خالی کر دیا تھا۔ اور انگلستان کی سیاسی شکنجے میں ہندوستان جکڑتا جا رہا تھا۔ اس

کا احساس حالی کی نظم "حب وطن" میں ملتا ہے۔

کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا　　کبھی درانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتل عام کیا　　کبھی محمود نے غلام کیا
ملک روندتے گئے ہیں پیروں سے　　چین کس کو ملا ہے غیروں سے

اور حالی اس کا سبب خود تلاش کرتے ہیں :

ملک ہیں اتفاق سے آزاد　　شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا اگر　　کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر

یورپ کے صنعتی انقلاب اور مشینی ترقی کا اثر براہِ راست ہندوستان پر پڑا۔ مشینوں کی ایجادات سے گھریلو دستکاری ختم ہونے لگی۔ دیہی زندگی اور زراعت میں نت نئے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ مغربی مشنریاں مذہبی عقائد کو کمزور کر رہی تھیں۔ اس تصادم و کشمکش میں ہندوستانی معاشرہ اور روایتی نظام درہم برہم ہو گیا۔ ہر طرف بے چینی پھیل چکی تھی۔ اسی بے چینی کے ماحول میں خیر خواہان وطن و قوم اور مصلحین مختلف تحریکیں چلائیں اہل وطن اور مسلمانوں کو پستی سے نکال کر ترقی کی طرف لے جانے، بے بسی و مایوسی سے نجات دلانے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ کئی تحریکیں وجود میں آئیں۔ مسلم معاشرے کی اصلاح سے متعلق تحریکوں میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحریک اہم تھی۔ انہوں نے شہنشاہیت کے خلاف آواز اٹھائی اور عوام کو بیدار کیا ان کے بیٹے اور جانشین شاہ عبد العزیز نے اور آگے بڑھ کر غیر ملکی اقتدار کے خلاف ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا۔ مولوی شریعت اللہ نے بنگال میں "فرائضی تحریک" کی داغ بیل ڈالی۔ (۱۱) جس کا مقصد اصلاح مذہب تھا۔ ان کے بیٹے ان کے جانشین ہوئے۔ اور اس مہم کو جاری رکھا مگر فرائضی تحریک زیادہ تر بنگال تک محدود رہی۔ شمالی ہند میں سید احمد بریلوی کا اثر تھا۔ ان تحریکوں نے مسلم عوام کو بیدار کیا اور استحصال کے خلاف ان کو آگاہ کیا۔

بقول پی سی جوشی کہ :

> "ہندوستان کے وہابیوں نے مسلم عوام کو بیدار کیا اور انہیں برطانوی اور مسلمان جاروں کے سپاہی جو روستم اور ہندوستانی مفاد پرستوں کے معاشی استحصال سے نجات حاصل کرنے پر اکسایا۔ انہوں نے مسلم معاشرے کے اندر طبقاتی امتیازات کو کسی قدر مٹانے میں مدد دی اور اصلاح کے لیے روشن خیال طبقے کو غیر مطمئن عوام کے ساتھ متحد ہونے پر آمادہ کیا۔ احیاء اسلام کی تحریک ان وہابی رہنماؤں کی اولین کوششوں کی رہین منت ہے جس سے انگریزوں کے خلاف مسلم معاشرے کے مختلف طبقوں

میں بھی اتحاد کا ایک وسیع محاذ پیدا ہو گیا۔ اس محاذ میں سب ہی شامل تھے۔ جائیدادوں سے محروم امراء ، تباہ حال دستکار، ناکام و نامراد علماء غیر مطمئن فوجی، یہی نہیں بلکہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے بھی ایک مشترک محاذ قائم کیا۔"(۱۲)

شاہ ولی اللہ کی تحریک اقتصادی و معاشی بحران کے نتیجے میں آئی تھی۔ لیکن مفکرین و مصلحین کے لیے ایک راستہ ہموار کر گئی۔ بلکہ اس سے پہلی جنگ آزادی کے لیے فضا ساز گار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بقول معین احسن جذبی :

"دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ سلطنت مغلیہ زوال کی آخری منزلیں طے کر رہی ہے۔ جاگیرداری نظام کا انحطاط تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ سوداگری اور دستکاروں کا طبقہ ابھرنا چاہتا ہے لیکن انتشار اور بدامنی کا سیل بے اماں اس کو ابھرنے نہیں دیتا اس افراتفری کی زد میں مسلمان بھی تھے۔ شاہ ولی اللہ (۱۷۶۲ء۔ ۱۷۰۲ء) کی تحریک اس دور میں اسی انتشار و اضطراب کی ترجمان ہے۔

شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کی بنیادیوں تو مذہب اور اخلاق پر ہے۔ لیکن اس سلسلے میں وہ جن اصولوں کو وہ لے کر اٹھے وہ براہ راست اس دور کی سیاسی اور اقتصادی حالات ہی کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ ان کے اخلاقی نظام میں مرکزی حیثیت "عدالت" کی ہے اور اس کے بارے میں ان کا نظریہ یہ ہے کہ : "کسی سوسائٹی میں عدالت وانصاف پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ رزق کمانے والی جماعتوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے سے احتراز کلی نہ برتا جائے۔"(۱۳)

شاہ ولی اللہ پہلے مسلم مفکر ہیں جنھوں نے مسلم معاشرے کی اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی انحطاط کی طرف توجہ دی اور اپنی سعی سے ایک نظام فکر پیش کیا۔ ان کی فکر میں اقتصادی معاملات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور اسی نقطہ نظر سے وہ قوموں کے عروج و زوال کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انحطاط کی جڑ اقتصادی مسائل ہوتے ہیں اور اقتصادی انحطاط کی وجہ سے ہی اخلاقی انحطاط کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ **حجۃ اللہ البالغۃ** میں تحریر فرماتے ہیں کہ :

اگر کسی قوم میں تمدن کی مسلسل ترقی جاری رہے تو اس کی صنعت و حرفت اعلی کمال تک پہونچ جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر حکمراں جماعت آرام و اسائش اور زینت و تفاخر کو اپنا شعار بنالے تو اس کا بوجھ قوم کے کاریگر طبقات پر اتنا بڑھ جائے گا کہ سوسائٹی کا اکثر حصہ حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گا۔ انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہو جاتے ہیں جب کسی چیز سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے اس وقت وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح صرف روٹی کمانے کے لیے کام کریں گے۔(۱۴)

شاہ ولی اللہ اس دور میں جاگیر داروں کی نااہلیت اور شہنشاہیت سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا اندازہ لگا چکے تھے۔ ان کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ اب جاگیر داری نظام فرسودہ ہو چکی ہے اس میں اتنی سکت باقی نہیں کہ معاشی ابتری سے معاشرے کو ابار سکے۔ ان کو اس بات کا بھی احساس ہو چکا تھا کہ جاگیر داری نظام میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے نہ کاروبار سنبھالنے کی اہلیت۔ اس لیے ان کی نگاہ ایسے طبقے کو ڈھونڈھ رہی تھی جو اس پر آشوب دور میں معاشی ترقی کے لیے کام کر سکے۔ ان کی نگاہ سوداگروں اور کاریگروں پر پڑی جو ابھرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ لیکن حالات ناسازگار ہونے کی وجہ سے ترقی نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ اندازہ لگا چکے تھے کہ اگر اس طبقے کو موقع ملے تو یہ حکومت کی باگ ڈور بھی سنبھال سکتے ہیں۔ اس لیے شاہ ولی اللہ نے ان طبقوں سے وابستہ ہو کر تحریک کو اور تقویت بخشی۔ بقول خلیق احمد نظامی کہ :

> ''شاہ صاحب کو جس طبقے کی تباہی اور بربادی کا سب سے زیادہ خیال تھا وہ سوداگروں اور اہل حرفت ہی کا تھا۔ وہ اس طبقے کو ملک کی اقتصادیات کا مرکزی نقطہ سمجھتے تھے۔''(۱۵)

ان کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادے اور جانشین شاہ عبد العزیز نے اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ شاہ عبد العزیز صاحب کو یہ اندازہ ہونے لگا کہ انگریزوں کے رہتے مسلمان معاشی ترقی نہیں کر سکتے۔ اور معاشرتی و سیاسی ترقی معاشی ترقی پر منحصر ہے۔ اس لیے انگریزوں کا بڑھتا ہوا اقتدار مسلمانوں کی مذہبی اور معاشی تحفظ دونوں کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے انگریزی حکومت کو دار الحرب قرار دیا۔ بقول پی سی جوشی :

> شاہ ولی اللہ کی جانشینی قابل اور نڈر شاہ عبد العزیز کے حصے میں آئی۔ جس نے بلا تامل اعلان کیا کہ دہلی سے لے کر کلکتہ تک سارا ملک نصرانیوں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ وہ مطلق العنان اور اعلیٰ اقتدار کے مالک ہیں۔ جب کہ حیدر آباد، لکھنؤ اور رام پور کے نام نہاد مسلمان ان کے رحم و کرم پر ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہندوستان شرع کے رو سے دار الحرب نہیں رہا اور اب اسے دار الحرب تصور کرنا ہوگا۔''(۱۶)

اس طرح اسلامی تشدد پسندی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور انگریز ان اسلامی تشدد پسندوں سے پریشان ہو چکے تھے۔ وہابی تحریک کے رہنما شمالی ہند کے تمام اہم مراکز میں اپنی تنظیم کا جال بچھا چکے تھے اور علاقائی خلیفہ اور معتبر کارکن مقرر کر چکے تھے۔(۱۷) غرض کہ ۱۸۵۷ء تک جو کچھ ممکن تھا تخت و تاج حاصل کرنے کے لیے اور اسلام کو زندہ کرنے کے لیے وہابیوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ساتھ ہی آشفتہ حال بھی اسی موقع کی تلاش میں تھے۔ تاجر اپنی تجارت سے، کاشتکار اپنی زراعت سے، مزدور اپنی مزدوری سے پریشان تھے۔ بجا ٹیکس اور مشینی کام نے سب کو پریشان کر رکھا تھا۔ جاگیر داروں کی جاگیریں چھن چکی تھیں۔ بادشاہ کی سلطنتیں ختم ہو چکی تھیں۔ زمیندار کی زمینیں ضبط ہو چکی

تھیں۔ مذہب اور تہذیب جبراً تھوپا جارہا تھا۔ ایسی صورت میں انہیں ایک ہی راستہ دکھائی دیا۔ اور وہ تھا بغاوت کا جو ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کے جھنڈے کے نیچے (فوج سے لے کر مزدور تک اور سوداگروں سے لے کر زمیندار تک) سب اکٹھے ہوئے اور بغاوت کا علم بلند کیا۔ لیکن بغاوت کے بعد اس کا جو نتیجہ نکلا وہ کہیں اس سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے۔ بقول پی سی جوشی :

"۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد کئی مقامات پر ساری مسلم آبادی کو قتل کر دیا گیا۔ تمام شمالی ہندوستان میں وہابی رہنماؤں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر گرفتار کیا گیا۔ تاکہ انہیں پھانسی دی جائے۔ ان میں سے سینکڑوں کو جن میں ممتاز علماء بھی شامل تھے۔ توپوں سے اڑا دیا گیا۔ بہتوں کو انڈمان کی تعزیری بستی کو بھیج کر ملک بدر کر دیا گیا۔" (۱۷)

اس بغاوت پر تجزیہ کرتے ہوئے پی سی جوشی تحریر فرماتے ہیں کہ :

"اس وقت اس بغاوت کی ماہیت کو واضح طور پر نہیں سمجھا گیا تھا۔ بیشتر حالتوں میں اسے قہر الٰہی، فریب تقدیر، آسمان کی چشم بد، انقلاب زمانہ اور اعمال بد کی سزا تصور کیا گیا۔ اس اہم تاریخی واقعہ کی انفرادی تعبیروں سے وہ غلط راہوں پر پڑ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغاوت کی وسعت اور اصلیت کو سمجھنے کی کوشش نہ کی گئی۔ صرف یہی نہیں بعض حلقوں میں جو بظاہر انگریزوں کے زیر اثر تھے۔ اس کا یہ مطلب لیا گیا کہ یہ موجودہ حکومت کے خلاف بغاوت ہے۔ یہ خیال اس قدر غالب ہوا کہ بغاوت کو قومی تحریک کے ساتھ وابستہ کرنے میں بہت دیر لگی، جوں جوں نیا مواد ہاتھ لگے گا اور مزید حقائق کا انکشاف ہوگا بغاوت کا بے لاگ جائزہ لینے میں مدد ملے گی۔" (۱۸)

حالی نے انہی احساسات و جذبات کو "مسدس حالی" کے مقدمہ میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

قوم کی حالت تباہ ہے، عزیز ذلیل ہو گئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے ہیں، علم کا خاتمہ ہو چکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے، افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کے چاروں طرف دوہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امراء جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہونچا سکتے ہیں غافل اور بے پرواہ ہیں۔ علماء جن کا قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ ایسے وقت میں جس سے کچھ بن آئے سو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی ہماری سلامتی ہے۔ (۱۹)

یہی وہ حالات تھے جس کو حالی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور انہی حالات کو وہ "مد و جزر اسلام" کے نام سے

مسدس میں قلم بند کیا۔ حالی ان حالات سے نجات کا سبب بھی تلاش کرتے ہیں بلکہ آغاز ہی سبب سے کرتے ہیں :

کسی نے یہ بقراط سے جاکے پوچھا　　مرض ترے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا　　کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیاں سمجھیں
سبب یا علامت گر ان کو بجھائیں　　تو تشخص میں سو نکالیں خطائیں
دوا اور پرہیز سے جی چرائیں　　یوں ہی رفتہ رفتہ مرض کو بڑھائیں
طبیبوں سے ہرگز نہ مانوس ہوں وہ
یہاں تک کی جینے سے مایوس ہوں وہ

عرض یہ کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہر طبقے اور ہر پیشے کی مجموعی بے اطمینانی کا مظہر تھی۔ اس وقت حالی کی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی اور اس وقت حصار میں انگریزی حکومت کے ملازم تھے۔ ان ہولناک اور دہشت انگیز حالات نے حالی پر جو اثر ڈالا اس کی جھلک حالی کی تخلیقات میں نظر آتی ہے۔ حالی ایک بار پھر بے روزگار ہو گئے۔ بہت سے گھرانے دہلی سے بھاگ کر پانی پت میں پناہ گزیں ہوئے۔ جب حالی دہلی واپس آئے تو دہلی تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ حالی نے اس برباد دہلی کو دیکھ کر جو اثر لیا وہ ان کی نظم سے ظاہر ہوتا ہے۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نے رلانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینہ پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتائے خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو

اے فلک اس زیادہ نہ مٹانا ہر گز
جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں اک ایسا گھرانا ہر گز
بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دور زماں
نہ ابھی نیند کے ماتھوں کو جگا ہر گز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانا ہر گز

اس بغاوت کی ناکامی کے اسباب کچھ بھی رہے ہوں لیکن اس بغاوت نے انگریزوں کو اپنی اقتدار مستحکم کرنے کے لیے نئی پالیسی وضع کرنے پر مجبور کر دیا۔ بقول تاراچند :

نئے نظامِ سلطنت کے فوری اثرات انتہائی افسوس ناک اور مایوس کن ثابت ہوئے۔ اعلیٰ ملازمتوں میں ہندوستانیوں کا مکمل خاتمہ اور امور سلطنت میں کسی طرح کی مداخلت سے ان کی یک لخت ر طرفی انتہائی خراب اور دوررس نتائج کی حامل تھی۔ کمپنی کے کچھ اعلیٰ حکام کو اس طرح کے نظام کی ناشائستگی اور نادانی کا احساس تھا۔ ولزلی نے کورٹ آف ڈئرکٹرس کو لکھا : ''ہندوستان میں ہماری نو آبادیات کے آئنی نظام کی بنیادی خامی یہ ہے کہ اس میں کوئی ایسا طریقہ نہیں اختیار کیا گیا ہے جس کا مقصد ہماری اس نوعیت رعایا کی خیر خواہی حاصل کرنا ہو یا سیاسی بے چینی پر قابو پانا ہو جس کے ہاتھوں میں حکومت تھی اور وقار دولت اور اختیارات کے کھو جانے سے پیدا ہونے والے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کوئی مناسب قدم اٹھائے بغیر جن کو ہم نے آمدنی، عزت اور اقتدار کے حقوق سے محروم کر دیا ہے۔(۲۰)

ابوالحسن علی ندویؒ کی رائے یہ ہے کہ :

سلاطین و حکام کا استبداد ان کی مطلق العنانی، جبر و تعدیٰ، احکام شریعت سے چشم پوشی اور کھلی ہوئی نفس پرستی جو دینی حوصلہ مندوں کو انقلابی تحریک اور بغاوت پر آمادہ کر دیتی ہے۔(۲۱)

۱۸۵۷ء کا قہر مسلمانوں پر جم کر ٹوٹا کیونکہ انگریز یہ سمجھ گئے تھے کہ بغاوت مسلمانوں کی ایک سازش تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے ہی حاصل کی تھی۔ اس لیے یہ سمجھ گئے تھے کہ مسلمان کھوئی ہوئی حکومت واپس لینا چاہتے ہیں اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہابی تحریک انگریزوں کے خلاف تھی اور اسلامی اقدار اور اقتدار کو

حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جس سے انگریزوں کا غصہ اور بڑھ گیا تھا۔ اس لیے ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کا غضب و قہر مسلمانوں پر ہی ٹوٹا۔ اس دوران سر سید احمد خاں مسلمانوں اور انگریزوں کے بیچ مفاہمت کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ حالی صورت حال کا اندازہ لگا کر سر سید کے ہم نوا ہو گئے اور اس تحریک کو تقویت پہچانے کی سعی کرتے رہے۔

حالی سر سید تحریک سے وابستہ تھے لیکن سر سید کے مذہبی نظریات سے کلیتًا اتفاق نہیں رکھتے تھے لیکن یہ بات بھی غور طلب ہے کہ حالی سر سید کے مداح نظر آتے ہیں۔ بشر کی حیثیت سے جو سر سید میں خامی ہے اس کی بھی نشاندہی کرتے ہیں اور اس کا جواز ڈھونڈتے ہیں۔

دیباچہ میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

> اگرچہ ہندوستان میں جہاں ہیروں کے ایک عیب یا خطا معلوم ہونا اس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بائیوگرافیکل طریقے سے لکھی جائے اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دیکھائی جائیں اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور اس کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی ..... لیکن ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے۔ تقلید کی جڑ کاٹی ہے بڑے بڑے علماء و مفسرین کو لتیڑا ہے اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے، قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے تصدیق کیا ہے تو دوسرے نے زندیق کا خطاب دیا ہے اور جس کو پالٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راست باز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیوں کر لکھی جا سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا اپن ٹھوک بجا کے دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اس کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ اگر سر سید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعویٰ ہے اور نہ اس کے ثابت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلا ئیے کہ سر سید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا اور اس لیے ضروری ہے کہ ان کے ہر ایک کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے کیونکہ سچ میں اور صرف سچ ہی میں یہ کرامت ہے کہ جس قدر اس میں زیادہ کرید کی جاتی ہے اسی قدر اس کے

جوہر زیادہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔"(۲۲)

حالی سرسید احمد کے مذہبی نظریات سے اختلاف کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سر سید کی نظریات کی تردید کرتے ہیں۔ بلکہ اختلاف صرف ان باتوں میں کرتے ہیں جہاں عقائد پر زد پڑے۔ مثلاً اسلامی جمہور کی رائے سے اتفاق رکھتے ہیں۔ لیکن سر سید کی مذہبی خدمات کو سراہا ہے۔ انہوں نے ایک مضمون "سر سید کی مذہبی خدمات" کے نام سے لکھا جس میں ان کے تمام نظریات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالی سر سید احمد کے خدمات کو دل و جان سے تسلیم کرتے ہیں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

"اہل ملک میں جو لوگ سید صاحب کی سرگرمی اور جانفشانی کو شائبہ اعتراضِ نفسانی سے پاک اور مژدہ نہیں جانتے یا ان کی رائے کو قرین صواب نہیں سمجھتے۔ یا ان کو مسلکِ ہدیٰ سے متجاوز رکھتے ہیں۔ اگرچہ میں نہ کبھی پہلے ان سے ہم زبان ہوا نہ اب ہوں اور امید ہے کہ آگے کو بھی نہ ہوں گا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ تحریر سے پہلے ان کے باب میں میری رائے کبھی تذبذب اور تردد سے خالی نہیں رہی لیکن الحمد للہ کہ میرے تذبذب کا منشا کوئی داعیہ نفسانی نہ تھا۔ لہذا میرے خلوص نے مجھے اس فرض سے نجات دی اور جو رائے میری اب ہے غالباً یہی قریب صواب بھی ہے۔"(۲۳)

حالی سرسید کے نظریات کی اشاعت اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ کرتے ہیں۔ اور سر سید کے الوالعزمی کو تسلیم کرتے ہیں۔ حالی اس بات کے قائل ہیں کہ ہر روایت شکن کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس لیے سر سید پر جو بے جا اعتراضات ہیں ان کا اثر سر سید کی صحت پر کچھ نہیں پڑنے والا۔ کیونکہ یہ اعتراضات ہر زمانے میں ہوتے آئے ہیں اور جب بھی رسوم و روایات کے خلاف یا اسلاف کے فرسودہ قوانین میں کوئی نئی بات یا انقلابی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی وہ شخص طعن و ملامت کا شکار ہوا ہے۔ اس لیے سر سید پر اعتراض بے معنی ہے۔ (ہاں ان اعتراضات کو جو حالی بھی قبول کرتے ہیں جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) اس وجہ سے سر سید کی آزادئ رائے کو حالی قبول کرتے ہیں اور اس کو عوام میں مقبول بنانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ وہ تحریر کرتے ہیں :

"رعیت کی آزادی جو اس سلطنت کی بے بہا اور برگزیدہ خاصیتوں میں سے ایک ہے اور جس کی حقیقت نہ جاننے سے سلطنت کی بڑی خوبی ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی تھی۔ اگرچہ سچ پوچھئے تو اس کی معرفت کا دروازہ جو ہم پر کھلا، اس کی کنجی سر سید صاحب کی آزاد تحریریں ہیں ہم کو وہ زمانہ یاد ہے کہ ایام غدر کے بعد ہنوز بغاوت کی آگ مدھم نہیں ہوئی تھی اور گورنمنٹ کی نگاہ ہندوستانیوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً غضب آلود پڑتی تھی اور چند نااہلوں اور خیر سروں کے الزامات نے برٹش انڈیا

کی کل قوموں کو خوف ورجا اور امید وبیم کے بھنور میں ڈال رکھا تھا اور کیا دوست اور کیا دشمن اور کیا مخالفت اور کیا موافق سب کے دلوں پر رعب سلطنت چھایا ہوا تھا اس وقت اس الوالعزم جواں مرد نے وہ کام کیا جس سے گورنمنٹ کی حق پسندی اور حق شناسی رعایا پر اور رعایا کی بے گناہی اور بے جرمی گورنمنٹ پر "کاالشمس فی رابعة النهار" کا آشکار ہو گئی۔ رسالہ اسباب بغاوت ہند کا لکھنا اگرچہ سید صاحب کی آزاد اور بے باک طبیعت کی بے شمار موجوں میں سے ایک موج تھی لیکن ہمارے گرانبار کرنے کو یہ احسان کچھ کم نہ تھا۔"(۲۴)

حالی کے مذہبی اور تعلیمی نظریات کی وضاحت سے قبل تاریخی پس منظر پر سرسری نگاہ ڈالنا مناسب ہوگا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہو گیا۔ پہلے جاگیرداروں کی مالی امداد سے مدرسے چلائے جاتے تھے۔ انگریزی حکومت کے تحت اب اوقاف قائم ہو گئے جو مدارس کے لیے مالی امداد مہیا کرایا کرتے تھے۔ جب اوقاف پر انگریزوں کا تسلط زیادہ بڑھ گیا تو بغاوت کے بعد انگریزی پالیسی کے تحت ان مدارس کا بھی زوال تیزی سے ہونے لگا۔ بقول ثریا حسین کہ :

"بعض لوگ اس بات سے دہشت زدہ تھے کہ انصاف کے خلاف انگریزی حکومت نے ان اوقاف کو بالخصوص بنگال میں ضبط کیا جن سے دینی مدرسے چلتے تھے۔"(۲۵)

دوسری طرف انہوں نے سرکاری ملازم تیار کرنے اور حکومت کو مستحکم بنانے کی غرض سے انگریزی تعلیم کی بنیاد ڈالی تاکہ انگریزی کے فروغ کے ساتھ عوام پہ انگریزی حکومت کی خیر وبرکت واضح ہو جائے اور حکومت مضبوط تر ہوتی جائے۔ ان اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے ۷ / مارچ ۱۸۳۵ء گورنر جنرل لارڈ مائونٹ بیٹنگ کی صدارت میں کونسل کی ایک نشست ہوئی جس میں یہ قرارداد پاس ہوا کہ :

"گورنر جنرل یہ اجلاس کونسل کی رائے ہے کہ حکومت برطانیہ کا مقصد اہل ہند میں یورپی ادب اور سائنس کی اشاعت کرتا ہے اور تعلیم کے لیے جس قدر رقم مخصوص ہے وہ اب صرف انگریزی تعلیم پر صرف ہونی چاہئے۔"(۲۶)

انگریزوں کا مقصد یہ نہ تھا کہ مدارس کے ذریعہ جو تعلیم دی جاتی ہے اس سے صرف دیسی لوگوں کو ہی فائدہ پہنچتا ہے اس لیے ایسے مدرسے اور کالج کو توڑ دیا جائے جن سے دیسی (ہندوستانی) لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہو۔ جس کے نتیجے میں وہ تمام مدارس ختم ہونے لگے جن کی امداد انگریزی وقف پر منحصر تھی۔ مثلاً مدرسہ عالیہ کلکتہ کی مالی امداد انگریزی حکومت پر منحصر تھی اس وقت کے مشہور مدارس میں دلی کے مدرسہ رحیمیہ، لکھنؤ کے فرنگی محل اور خیر آباد کے مدارس قابل ذکر

ہیں۔ان سب کا زوال شروع ہو گیا۔

عرض یہ کہ ایک طرف مدارس کی تعلیم بد سے بد تر ہوتی جارہی تھی تو دوسری طرف جدید تعلیم فروغ پارہی تھی۔ غیر مسلموں نے ان حالات سے سمجھوتہ کر کے اپنی تعلیمی کاوشیں تیز کر دیں اور انگریزوں کی مدد سے جدید تعلیم کے ادارے قائم کرنے لگے۔ مثلاً ۱۸۱۶ء کلکتہ ہندو کالج بنگالی میں قائم ہوا، جے نارائن گھوسی نے بنارس میں ۱۸۱۸ء میں میں انگلش اسکول کھولا، ۱۹۲۱ء میں سنسکرت کالج ایچ ایچ ولسن کی سفارش پر قائم ہوا اور ۱۹۲۱ء میں ہندو کالج پونہ اور ہندو کالج آگرہ قائم ہوا۔ ۱۸۲۳ء میں پھر مدارس اور ممبئی میں کئی اسکول کھلے۔ اس کے علاوہ ہندو مصلحین نے ہندو معاشرے کی اصلاح کے لیے بہت سی مذہبی تحریکیں چلائیں۔ راجارام موہن رائے نے برہمو سماج کی بنیاد ڈالی، دیو نند ناتھ ٹیگر اور کیشپ چندر نے مختلف جگہوں کے دورے کیے۔ ذات پات کی تفریق کو ختم کرنے پر زور دیا اور تعلیمی سرگرمیوں میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کی ترغیب دی۔ دھرلو نائیڈوں نے مدراس میں وید سماج کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد قدیم مذہب کو باقی رکھنا تھا۔ مہادیو گونڈرا ناڈے نے ممبئی میں پرارتھنا سماج قائم کی، شمال میں سوامی دیانند نے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی، رام کرشن، پرم ہنس نے اصلاحی کام شروع کیا۔ اس طرح ہندوؤں میں بہت سی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔ ان سب نے بدلتے وقت کے ساتھ مذہب میں ضروری تبدیلی اور اصلاح کی کوششیں کیں۔ مسلمانوں میں اصلاحی غرض سے بہت کم کام ہوئے۔ نواب عبد اللطیف نے ''محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ'' میں قائم کی، لیکن یہ سوسائٹی بھی وہ خدمت انجام نہ دے سکی جس کی اس وقت مسلمانوں کو ضرورت تھی۔ ۱۸۶۶ء میں مدرسہ دیوبند ظہور پذیر ہوا لیکن خالص مذہبی تعلیم تک محدود رہا۔ اس طرح لے دے کے ایک سر سید تحریک تھی جو فعال نظر آرہی تھی۔ سر سید احمد کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ اس شکست وریخت کے دور میں اگر مسلمانوں کی اصلاح نہ کی گئی تو شاید ہندوستان سے ان کا وجود مٹ جائے گا۔ سر سید ۱۸۵۷ء کی بغاوت دیکھ چکے تھے اور یہ بغاوت اس کام کے لیے ان کو ابھارتی رہی۔ بقول ثریا حسین کہ :

> انسانی فکر کی تشکیل اور اس کے عمل کی سمت متعین کرنے میں ماحول اور گرد و پیش کے حالات کا دخل ہوتا ہے۔ سید صاحب کی زندگی کا رخ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ رستاخیز سے متاثر ہوا۔ (۲۷)

چونکہ مسلمان مذہبی و سیاسی تعصب اور مغائرت کی وجہ سے انگریزوں سے دور ہوتے جارہے تھے اس لیے حکومت کی جانب سے مسلمانوں کی طرف توجہ نا کے برابر ہوتی تھی۔ مسلمانوں کی ایک اور کمی یہ تھی کہ مسلمان غیر جانبدارانہ طور پر یہ سوچنے کے لیے تیار نہ تھے کہ اس نظام کی خوبی و خامی کیا ہے۔ جس سے بچا جائے یا استفادہ کیا جائے۔

جس کی وجہ سے مسلمان اور انحطاط کی طرف جارہے تھے۔ اور انہیں انحطاطی دور کو ختم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی ، معاشی اور تہذیبی نظریات میں بدلاؤ لایا جائے۔ کیونکہ بغیر بدلاؤ کے قوم کی فلاح و بہبود کا کام کرنا بہت مشکل تھا۔ حالی اس معاملہ میں سر سید کے ہم خیال رہے۔ اس لیے سر سید کے مشن میں پوری طرح جٹ گئے اور دین کی تاویل زمانے کی ضرورت کے موافق بیان کرنے لگے۔ حالی دین کے متعلق یوں بیان کرتے ہیں۔

"صرف دین اسلام ہی وہ دین ہے کہ جب اس کی اصل ماہیت پر نظر کی جاتی ہے تو وہ نہایت پاک اور سچا دین ہوتا ہے۔ یہ دین انسان کی آزادی کو قائم رکھتا ہے اور اس کو کسی دشوار بات کے کرنے یا ماننے پر مجبور نہیں کرتا۔ اس میں تثلیث اور کفارہ جیسی کوئی انوکھی بات تسلیم کرنی پڑتی ہے نہ رہبانیت جیسی کوئی سخت مشقت اٹھانے کی ضرورت ہے۔"(۲۸)

آگے تحریر فرماتے ہیں :

"پس اس دین کے ہادی اور دنیا کے رہبر نے جیسا اپنے منصبی فرائض یعنی تبلیغ احکامِ الٰہی کو ضروری سمجھا اور ان کو مبداء و معاد کی حقیقت سے آگاہ کیا اور ان کے عقائد باطلہ اور اخلاق رذیلہ کی اصلاح فرمائی اس طرح رقت نوعی اور قومی ہمدردی کے مقتضا سے ان کے طریق معاش کو درست کیا۔ ان کی مجلسوں میں تہذیب، بھلائی، لباس وطعام کے آداب سکھائے، نشست وبرخاست کے قاعدے بتائے ، سلام، مصافحہ، معانقہ، تہنیت، تعزیت، مہمانی، ضیافت، بیاہ، شادی، لین دین، سفر، اقامت، کھیتی ، تجارت، حفظ صحت، دوادارو غرض کہ جملہ امور دنیوی کے اصول تعلیم فرمائے مگر اسی قدر جتنے کہ اس زمانے اور ملک کے مناسب تھے۔"(۲۹)

حالی کا مقصد تھا کہ مسلمان دین کی ترقی کے ساتھ دنیا کی بھی ترقی کرتے لیکن مسلمانوں کو یہ بتانا آسان نہیں تھا کہ کیونکہ ان کے یہاں دین کا غلط مطلب سرایت کر چکا تھا اس لیے دین کی صحیح تاویل کو ان کا ذہن قبول نہیں کرتا تھا۔ اس لیے صحیح دین کو پیش کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے حالی شاہ ولی اللہ کی تحریک کو موزوں سمجھتے تھے تاکہ دین اور دنیا دونوں کی ترقی ہو۔ وہ اسلام کی حقیقت میں یقین رکھتے تھے اور اس کی تبلیغ کرتے رہے۔ حالی کو یہ بات بہت بری معلوم پڑتی ہے کہ دین کا لبادہ پہن کر دنیا کی ثروت کمائی جائے اور دین کو مسخ کر کے پیش کیا جائے جیسا کہ اس دور میں ہونے لگا تھا۔ اس لیے وہ شاہ ولی اللہ کی تحریک سے بہت متاثر نظر آتے ہیں اور ان ڈھکوسلوں کو توڑنے کی کوشش کرتے ہیں جن کو شاہ ولی اللہ نے اپنی تحریر و تحریک کے ذریعہ ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ مثلاً بے جا پیری مریدی کا رواج اور بدعت وخلاف سنن رسوم وغیرہ۔ حالی نے بھی اسی پر وار کیا اور قوم کو جگانے کی کوشش کی۔ مسدس میں وہ اس موضوع

کو یوں نظم کرتے ہیں :

بہت لوگ پیروں کی اولاد بن کر　　نہیں ذات والا میں کچھ جن کے جوہر
بڑا فخر ہے جن کو لے دے کے اس پر　　کہ تھے ان کے اسلاف مقبولِ داور
کرشمے ہیں جا جا کے جھوٹے دکھاتے
مریدوں کو ہیں لوٹتے اور کھاتے

بڑھے جس سے نفرت وہ تقریر کرنی　　جگر جس سے شق ہوں وہ تحریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی　　مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی
یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں　　اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں　　شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

حالی کا مقصد تھا سر سید تحریک کو تقویت پہچانا جیسا گذشتہ اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس لیے حالی کو یہ خطرہ تھا کہ کہیں مذہب کی آڑ میں سر سید تحریک نہ معدوم ہو جائے اور سر سید کے اصلاحی پروگرام ناکام نہ ہو جائیں۔ چونکہ سر سید پر بھی وہابی تحریک کا اثر تھا وہ بھی بدعت اور خلافِ سنن کے مخالف تھے۔ بلکہ اس کے خلاف انہوں نے ایک رسالہ بھی لکھا "سراہ سنت در رد بدعت" جس میں سنن کی تائید اور بدعت کی مخالفت کی۔ حالی بھی اس پر ایمان رکھتے تھے اس لیے وہ مذہبی نظریات میں سر سید کے ساتھ ہو گئے اور ان کی تبلیغ و اشاعت کرنے لگے۔ سر سید پر اس وقت الحاد و کفر کا فتویٰ لگایا جا رہا تھا اس لیے یہ ضروری تھا کہ سر سید کے مذہبی افکار کو صحیح طور پر پیش کیا جائے۔ حالی نے یہ کام بخوبی انجام دیا اور سر سید کے نظریات کی توسیع کی۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

"سر سید کی لائف میں منجملہ ان مختلف حیثیتوں کے جو ان کی ذات میں جمع تھیں۔ سب سے زیادہ مہتم بالشان اور سب سے زیادہ لحاظ کے قابل بلکہ ان کی تمام لائف کی جان مذہبی حیثیت ہے۔" (۳۰)

حالی سر سید کے نظریات کو اس لیے بھی پسند کرتے تھے کہ یہ نظریات اس وقت کے لیے اشد ضروری تھے

کیونکہ غدر کے بعد کے حالات اس قابل نہیں تھے کہ بغیر مذہبی رجحان کو بدلے اور انگریزوں سے بغیر مفاہمت کیے مسلمان ترقی کر سکیں۔ اس لیے حالی سر سید کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"مسلمان مذہبی تعصّبات میں سخت بدنام تھے اور انہیں تعصّبات کی بدولت غدر کے بعد ان کی پولیٹیکل حالت کو سخت صدمہ پہنچا تھا اور آئندہ اس سے بھی سخت تر آفتوں کا سامنا نظر آتا تھا۔ سر سید کو جس طرح اسلام کے دین برحق ہونے کا یقین تھا اسی طرح اس بات کا بھی یقین تھا کہ سچا دین انسان کے حق میں خدا کی رحمت ہونا چاہئے اس لیے انہوں نے سمجھا کہ اسلام ہرگز ایسے تعصّبات کی تعلیم نہیں دے سکتا جن کی بدولت ہندوستان کی چھ کروڑ مخلوق طرح طرح کی آفت و حوادث کا نشانہ بن رہی ہے۔ ورنہ بجائے اس کے کہ اسلام کو خدا کی رحمت سمجھا جائے وہ انسان کے حق میں سخت ترین عذاب الٰہی ہوگا۔"(۳۱)

حالی کا ماننا ہے کہ نئی حقیقتوں سے آنکھ نہیں چرانا چاہئے بلکہ اس کی اہمیت کو گردانا جانا چاہئے اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے جیسا کہ دوسری قومیں اٹھا رہی ہیں۔

یہاں اور میں جتنی قومیں گرامی　　خود اقبال ہے آج ان کا سلامی
تجارت میں ممتاز دولت میں نامی　　زمانے کے ساتھی ترقی کے حامی
نہ فارغ ہے اولاد کی تربیت سے
نہ بے فکر ہیں قوم کی تقویت سے

قومی ترقی میں حالی بیجا تقلید کے مخالف ہیں وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ زمانے کے ساتھ اصول میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اگر تبدیلی نہیں ہوتی تو مروجہ اصول قائم نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ موجودہ زمانہ قدیم زمانے سے مختلف ہوتا ہے اور قدیم زمانے کے تقاضے موجودہ زمانے کے تقاضوں سے مختلف ہیں۔ اگر ان تقاضوں کی نوعیت کو نہ سمجھا جائے اور ان تغیرات پر غور نہ کیا جائے تو یہ اپنی بربادی کی دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اس لیے حالی زمانے کی تبدیلی کے ساتھ تہذیب و تمدن میں بھی تبدیلی لانے پر زور دیتے ہیں۔ ان کا یہ یقین ہے اگر جدید نظام کے ہم دوش نہ ہوتے تو شکست خوردگی کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا وہ اس بابت تحریر فرماتے ہیں :

"اگرچہ گذشتہ زمانے میں اسلام کو جس قسم کی مشکلات پیش آئیں علماء اسلام نے ان کو بخوبی حل کیا اور اپنے فرائض کا حق پورے طور پر ادا کر گئے مگر جو مشکل اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش تھی چونکہ وہ کبھی ان کے زمانے میں پیش نہیں آئی تھی۔ اس لیے ان کو حل کرنے کی ضرورت محسوس

نہیں ہوئی۔ ایک ہزار برس سے زیادہ عرصے تک مسلمانوں کو کسی غیر قوم کی رعایا ہونے کا بہت کم اتفاق ہوا تھا وہ ایک آدھ مستثنیٰ (۱) صورت کے سوا ہمیشہ جہاں کہیں رہے حکمراں رہے اور غیر قومیں ان کی محکوم رہیں اس لیے جو برتاؤ مسلمانوں کو اصول اسلام کے موافق کسی غیر قوم کے محکوم ہونے کی حالت میں اس قوم کے ساتھ رکھنا چاہئے اس کی طرف کبھی کسی کی توجہ مبذول نہیں ہوئی۔" (۳۲)

حالی چاہتے تھے کہ انگریزوں سے مفاہمت کر کے مسلمان ترقی کے راستے پر گامزن ہو جائیں۔ وہ اخلاقی ترقی کے لیے معاشی ترقی کو ذمہ دار سمجھتے ہیں کیونکہ معاشی ترقی ہی اخلاقی ترقی کی بنیاد ہے۔ (جیسا کہ شاہ ولی اللہ نے اپنی تحریر میں واضح کیا ہے) حالی موجودہ دور میں اخلاقی انحطاط و بگاڑ کو معاشی انحطاط ہی کا نتیجہ مراد دیتے ہیں۔ ان کا یہ بھی یقین ہے کہ اگر معاشی ترقی ہو گی تو اخلاق حسنہ سے لوگ آراستہ و پیراستہ ہوں گے اور جب اخلاق حسنہ سے آراستہ ہو جائیں گے تو ان میں وہی کردار پھر پیدا ہو جائیں گے جس کی بدولت وہ کسی زمانہ میں سب سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ قوم بن گئے تھے۔ مسدس میں وہ یوں رقمطراز ہیں :

فلاکت جسے کہتے ہیں ام الجرائم — نہیں رہتے ایماں پہ دل جس سے قائم
بناتی ہے انسان کو جو بہائم — مصلّی ہیں دلجمع جس سے نہ صائم

وہ یوں اہل اسلام پر چھا رہی ہے
کہ مسلم کی گویا نشانی یہی ہے

معاشی انحطاط کی وجہ سے قوم میں جس طرح کی برائیاں پیدا ہوئی ہیں ان تمام خرابیوں اور اخلاق رذیلہ کی نشاندہی حالی اپنے مسدس میں کرتے ہیں :

ہماری ہر اک بات میں سفلہ پن ہے — کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے

---

(۱) "اس سے مراد تاتاریوں کی سلطنت ہے جو ایک مدت تک ایران و ترکستان و دیگر ممالک میں مسلمانوں پر حکمراں رہے۔ لیکن آغاز تسلط میں جب کہ چنگیز خاں نے خروج کیا، تاتاریوں اور مسلمانوں کے تعلقات ہرگز ایسے نہ تھے جیسے بادشاہ اور رعیت میں ہونے چاہئیں۔ چنگیز خاں کہتا تھا کہ خدا نے مجھ کو مسلمانوں کے غارت کرنے کے لیے پیدا کیا ہے اور مسلمانوں اس کو فی الواقع اپنے حق میں غضب الٰہی جانتے تھے۔ مگر آخر کو تاتاریوں کی سلطنت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ آگئی تھی جس کو ایک اسلامی سلطنت سمجھنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ تین چار پشت کے بعد خود بادشاہ مسلمان ہو گیا اور آخر تک وہ اسلامی سلطنت رہی۔ پس اول میں سبب غائت عداوت کے اور آخر میں بہ سبب کمال رسوخ کے وہ تعلقات پیدا نہیں ہوئے جو بادشاہ اور رعیت میں ہونے چاہئیں۔ اور اس لیے مسلمان ایک غیر قوم کی حکومت میں بھی فرائض رعیت سے بے خبر رہی۔"

لگا نام آباء کو ہم سے گہن ہے ہمارا قدم ننگ اہل وطن ہے
بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے
عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے

نہ قوموں میں عزت نہ جلسوں میں وقعت نہ اپنوں سے الفت نہ غیروں سے ملت
مزاجوں میں سستی دماغوں میں نخوت خیالوں میں پستی کمالوں سے نفرت
عداوت کہاں دوستی آشکارا
غرض کی تواضع غرض کی مدارا

حالی کے لہجہ میں یہ جو تلخی پیدا ہوئی ہے وہ طعن و ملامت کے لیے نہیں پیدا ہوئی ہے بلکہ حالی احساس دلانا چاہتے ہیں کہ کہاں تھے ہم اور کہاں کھو گئے ہم۔ اس لیے ان کے احساس میں شدت اور تلخی آجاتی ہے۔ اخلاق کو بگاڑنے میں ہماری تنگ نظری اور ہمارا جانبدارانہ نظریہ بھی ذمہ دار ہے اس لیے حالی تعصب پر چوٹ کرتے ہیں :

تعصب نے اس صاف چشمہ کو آکر کیا بغض کے خار و خس سے مکدر
بنے خصم جو تھے عزیز اور برادر نفاق اہل قبلہ میں پھیلا سراسر
کہیں دستیاب ایسے اب دو مسلماں
کہ ہوں ایک کو دیکھ کر ایک شاداں

جنہیں چار پیسے کا مقدور ہے یاں سمجھتے نہیں ہیں وہ انساں کو انساں
موافق نہیں جن سے ایام دوراں نہیں دیکھ سکتے کسی کو وہ شاداں
نشہ میں تکبر کے ہے چور کوئی
حسد کے مرض میں ہے رنجور کوئی

حالی کے یہاں اسلاف کے وہ اقدار و اقتدار جس کی بدولت وہ معزز تھے اور چہار جانب ترقی کر رہے تھے۔ جن کے نشانات مشرق و مغرب میں اب بھی موجود ہیں ان سب کا شدید احساس ملتا ہے۔ حالی ان آثار و نشانیوں کی یاد دہانی کراتے ہیں اور احساس دلاتے ہیں کہ آج مسلمانوں کے ذلیل و خوار ہونے کی وجہ اپنے اسلاف کی صحیح پیروی نہ کرنا ہے۔

وہ سنگیں محل اور وہ ان کی صفائی جمی جن کے کھنڈروں پہ ہے آج کوئی
وہ مرقد کے گنبد تھے جن کے طلائی وہ معبد جہاں جلوہ گر تھی خدائی

زمانے نے گو ان کی برکت اٹھالی
نہیں کوئی ویرانہ پر ان سے خالی

اس کے بعد حالی جوش دلاتے ہیں :

پڑی ہیں سب اجڑی ہوئی خانقاہیں وہ درویش و سلطاں کی امید گاہیں
کھلی تھیں جہاں علم باطن کی راہیں فرشتوں کی پڑتی تھی جن پر نگاہیں
کہاں ہیں وہ جذب الٰہی کے پھندے
کہاں ہیں وہ اللہ کے پاک بندے

وہ علم شریعت کے ماہر کدھر ہیں وہ اخبار دین کے مبصر کدھر ہیں
اصولی کدھر ہیں مناظر کدھر ہیں محدث کہاں ہیں مفسر کدھر ہیں
وہ مجلس جو کل سربسر تھی چراغاں
چراغ اب کہیں ٹمٹماتا نہیں واں

مدارس وہ تعلیم دیں کے کہاں ہیں مراحل وہ علم و یقیں کے کہاں ہیں
وہ ارکانِ شرع متیں کے کہاں ہیں وہ وارث رسول امیں کے کہاں ہیں
رہا کوئی امت کا ملجا و ماوا
نہ قاضی نہ مفتی ، نہ صوفی نہ ملّا

کہاں ہیں وہ دینی کتابوں کے دفتر کہاں ہیں وہ علم الٰہی کے منظر
چلی ایسی اس بزم میں باد صرصر بجھیں مشعلیں نورِ حق کی سراسر
رہا کوئی ساماں نہ مجلس میں باقی
صراحی نہ طنبور مطرب نہ ساقی

حالی کو اپنے اسلاف کی گراں قدر دولت کے کھو جانے کا بے حد ملال ہے۔ وہ اقدار کی بازیافت کے لیے یاد دہانی کراتے ہیں کہ ہمارے اسلاف کے پاس کیا کچھ نہیں تھا؟ لیکن ہم آج اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے ان اقدار سے محروم ہو گئے جو ہمیں ورثہ میں ملے تھے۔

حالی عصری ضرورت کے موافق تعلیم نسواں کی حمایت بھی کرتے ہیں۔ سر سید احمد خاں نہ صرف مردوں بلکہ

عورتوں کی تعلیم کے بھی خواہاں تھے لیکن اپنے مشن اور حالات کے پیش نظر انہوں نے اس مسئلہ کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن حالی نے اس پر معمولی زور دیا اور اپنی رائے اس دور میں تعلیم نسواں کی حامی مشہور خاتوں سلطان جہاں بیگم فرماں روا بھوپال کے نام ایک نظم بھی پیش کی۔(۲)

اس طرح حالی سیاسی، سماجی، اخلاقی، معاشی اور تعلیمی سطح پر کافی حساس اور باشعور تھے اور ان سے متعلق اپنے نظریات کو پیش کر کے قوم کی اصلاح کرتے رہے وہ اپنے نظریات کے معاملے میں پختہ اور مستقل قدم تھے۔ ان نظریات کو انہوں نے نظم و نثر دونوں میں واضح کیا ہے۔ نظم میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے اور نثر میں اشاعت کے لیے۔ اس لیے حالی جب ادبی اصناف پر بات کرتے ہیں تو افادی پہلو کو پیش نظر رکھتے ہیں اس لیے انہوں نے اپنے نظریات کو پیش کرنے میں ان کا بھی خیال رکھا۔ اس لیے جب مسائل کو پیش کرتے ہیں تو ان کا انداز مبہم نہیں ہوتا اور نہ ہی ابہام گوئی کرتے ہیں بلکہ صاف اور واضح طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱.	ادبی سماجیاتی مطالعہ	محمد حسن	ص : ۴۳
۲.	مسدس حالی		ص : ۱۷
۳.	مقالات حالی		ص : ۲۴
۴.	مقالات حالی		ص : ۳۱
۵.	مقالات حالی		ص : ۳۴
۶.	مقالات حالی		ص : ۳۴
۷.	انتخاب حالی		ص : ۱۴
۸.	مسدس حالی		ص : ۱۳
۹.	حالی	مالک رام	ص : ۶۰
۱۰.	مسدس حالی کا مقدمہ		ص : ۵
۱۱.	سر سید احمد خاں اور ان کا عہد	ثریا حسین	ص : ۱۵
۱۲.	انقلاب ۱۸۵۷ء	پی سی جوشی	ص : ۹۲
۱۳.	حالی کا سیاسی شعور	معین حسین جذبی	ص : ۳۴
۱۴.	شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات	دیباچہ خلیل احمد نظامی	ص : ۱۰
۱۵.	شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات	دیباچہ خلیل احمد نظامی	ص : ۳۰
۱۶.	انقلاب ۱۸۵۷ء	پی سی جوشی	ص : ۹۱
۱۷.	انقلاب ۱۸۵۷ء	پی سی جوشی	ص : ۱۰۴
۱۸.	انقلاب ۱۸۵۷ء	پی سی جوشی	ص : ۲۴۶
۱۹.	مسدس حالی		ص : ۱۴
۲۰.	تاریخ آزادی ہند جلد اول	تاراچند	ص : ۱۴۱۸ـ۱۴۱۷
۲۱.	تاریخ دعوت و عزیمت حصہ چہارم	ابوالحسن علی ندوی	ص : ۵۹

۲۲.	حیاتِ جاوید	حالی	ص: ۲۸۔۲۷
۲۳.	مقالاتِ حالی		ص: ۳
۲۴.	مقالاتِ حالی		ص: ۶
۲۵.	سر سید احمد خاں اور ان کا عہد		ص: ۵۶
۲۶.	سر سید احمد خاں اور ان کا عہد		ص: ۲۱
۲۷.	سر سید احمد خاں اور ان کا عہد		ص: ۲۶
۲۸.	مقالاتِ حالی		ص: ۴۹
۲۹.	مقالاتِ حالی		ص: ۵۱
۳۰.	مقالاتِ حالی		ص: ۲۰۸
۳۱.	مقالاتِ حالی		ص: ۲۱۰
۳۲.	مقالاتِ حالی		ص: ۲۱۱

باب سوم

مسدس حالی کا سماجیاتی تجزیہ

اس سے قبل حالی کے تفکرات سے بحث کی جا چکی ہے۔ اس باب میں حالی کے مسدس میں پیش کردہ مواد و مسائل اور اس کی سماجی معنویت کے بارے میں بحث کرنی ہے۔

مواد کوئی غیر مرئی اشیاء نہیں ہے۔ بلکہ تخلیق کار انہیں خلائق اور موجودات سے اخذ کرتا ہے۔ وہ خلائق و موجودات کو اپنے حواس خمسہ کے ذریعہ محسوس کرتا ہے اور ان احساسات و معلومات کو اپنے ذہن میں محفوظ کرتا ہے۔ جو ضرورت کے موافق ترتیب پاتا رہتا ہے۔ اس لیے جب مواد پر بات کی جاتی ہے تو یہ بات فوراً ذہن میں گردش کرنے لگتی ہے کہ وہ کون سے عوامل و عناصر ہیں جو شاعر یا ادیب کو تخلیق پر مجبور کرتے ہیں اور ان کا عصری و معاشرتی تناظر کیا ہے۔ انہی عناصر و عوامل کا مطالعہ سماجیاتی مطالعہ کہلاتا ہے۔ اس لیے سماجیاتی مطالعہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان عوامل و محرکات کا پتہ لگایا جائے جس کی وجہ سے تخلیق وجود میں آئی۔ لہذا مسدس میں پیش کردہ مواد و مسائل کی عصری و معاشرتی معنویت کیا ہے اور اس کے محرکات کیا ہیں۔ اس باب میں اس سے بحث کی جائے گی۔

یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ حالی کی زندگی انتشار و بحران کے دور میں گزری تھی اور یہی انتشار و بحران ان کی تخلیقات کے محرک بنے۔ اسی دور نے حالی کو مسدس لکھنے پر مجبور کیا۔ سر سید سے رفاقت اور سر سید تحریک سے وابستگی ان کی زندگی میں طلاطم پیدا کر دی اور انہوں نے اپنی زندگی کو قوم کی اصلاح کے کام میں صرف کر دیا۔ حالی اس بات کا خود اعتراف کرتے ہیں کہ ایک سچے خیر خواہ (سر سید) نے آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑی شرم کی بات ہے۔ (۱) حالی چونکہ حساس دل اور متین دماغ کے مالک تھے اس لیے ان حالات کا بغور مطالعہ کیا اور ایک مصلح کی حیثیت سے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اسی اصلاح کی غرض سے حالی نے ایک مایہ ناز تخلیق "مدو جزر اسلام" نظم کی۔ جسے مسدس حالی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مسدس میں جن موضوعات کو پیش کیا گیا ہے وہ اس دور کی ضرورت تھی اس کا اندازہ مسدس کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس لیے

مسدس کے اجمالی جائزہ پر ایک نظر ڈالی جائے اور دیکھا جائے کہ مسدس میں کن موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔

حالی مسلمانوں کی زبوں حالی کو دیکھ کر بہت متفکر تھے کہ مسلمانوں کا اخلاقی، سیاسی، سماجی اور مذہبی انحطاط بہت تیزی سے ہو رہا تھا اور قوم کا احساس مر چکا تھا۔ چونکہ حالی قوم کو بلند وارفع دیکھنا چاہتے تھے اور پژمردہ زندگی میں نئی روح پھونکنا چاہتے تھے اور ایسی روح جو ہمارے اسلاف میں تھی جن کی بدولت وہ کامیاب و کامران ہوئے۔ اس لیے حالی نے اس نظم میں اپنے اسلاف کی داستان کو بیان کیا ہے اور اس نظم کے ذریعہ مسلمانوں کے سامنے ایک آئینہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ سب اپنی اپنی مسخ صورت کو دیکھ سکیں اور اپنی اصلاح کی فکر کر سکیں۔ حالی قوم کی بیماری کی علت بیان کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے علاج کی فکر کر سکیں۔ اس پوری نظم میں مسلمانوں کی ابتر حالت کا مختصر لیکن مجمل نقشہ کھینچا ہے اور اسلاف کے کارناموں کو پیش کیا ہے۔ نظم کا آغاز ایک قول کی وضاحت سے کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی ایسا مرض نہیں جو لاعلاج ہو بشرطیکہ مریض مرض پر توجہ دے اور تشخیص پر عمل کرے پھر ایک دوسری مثال سے بات واضح کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کی مثال ایک کشتی کی سی ہے جس پر بہت سے لوگ سوار ہوں اور وہ کشتی کسی طوفانی گرداب میں پھنس گئی ہو اور کنارہ بھی بہت دور ہو اور ہر لمحہ یہ خطرہ رہتا ہو کہ کشتی اب ڈوبی تب ڈوبی لیکن اہل کشتی خاموش سو رہے ہوں۔ ان کو ان خطرات کی ذرا بھی پرواہ نہ ہو۔ یہی حال آج مسلمانوں کا ہے۔

یہی حال دنیا میں اس قوم کا ہے　　بھنور میں جہاز آکے جس کا گھرا ہے
کنارہ ہے دور اور طوفاں بپا ہے　　گماں ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی

پھر حالی عرب کی طرف جاتے ہیں جہاں سے ایمان و عمل کی روشنی پھیلی تھی۔ وہ دور جاہلیت کا ذکر کرتے ہیں کہ اسلام سے قبل (زمانہ جاہلیت میں) عرب کی کیا حالت تھی اور وہ کتنی غیر مہذب قوم تھی۔ وحشیانہ اور مختلف طرح کی برائیاں ان میں پائی جاتی تھیں۔ جوا، شراب، زندہ بچیوں کو درگور کرنا، عام بات تھی۔ شخصی لڑائی خاندانی لڑائی بن جاتی تھی۔ مرنے والا اپنے گھر والوں کو لڑائی جاری رکھنے کی تاکید کرتا تھا۔ حالی ایک جنگ کی مثال دیتے ہیں :

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی　　صدی جس میں آدھی انہوں نے گنوائی
قبیلوں کی کردی تھی جس نے صفائی　　تھی اِک آگ ہر سو عرب میں لگائی
نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ

کرشمہ اِک ان کی جہالت کا تھا وہ

اِسی طرح اِک اور خوں ریز پیدا عرب میں لقب حرب واحس ہے جس کا
رہا ایک مدت تک آپس میں برپا بہا خون کا ہر طرف ایک دریا
سبب اس کا لکھا ہے یہ اصمعی نے
کہ گھوڑ دوڑ میں چیند کی تھی کسی نے

ایسی قوم میں آخری نبی کا نزول ہوتا ہے اور اتنے کم عرصے میں عرب کی تمام برائیاں زائل ہو جاتی ہیں۔ حالی نبی ﷺ کی اوصاف کو بیان کرتے ہیں :

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے در گذر کرنے والا بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا قبائل کا شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

رسول عربی کے ظہور کے بعد ان کی تعلیمات کا ذکر کرتے ہیں کہ محمد ﷺ نے ظلمت و گمراہی سے نجات دلا کر توحید و رسالت کے بنیادی اصولوں پر قوم کو یکجا کیا اور ان کو مخلوق کی غلامی سے نکال کر خدا کی غلامی میں لا کھڑا کیا۔

رسول عربی ﷺ توحید و رسالت کی تعلیم کے بعد انہیں معاشیات و معاشرت کے آداب سیکھاتے ہیں۔ ہادی برحق انہیں علم و عمل، ہمدردی و انکساری، پرہیز گاری و پاک بازی کی تعلیم دیتا ہے۔ انہیں وقت کی اہمیت کو بتاتا ہے اور فرصت کے اوقات سمجھاتا ہے۔

اس کے بعد حالی علم کی فضیلت بیان کرتے ہیں۔ علم کی قدر و قیمت کے بیان میں ایک حدیث کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

یہ کہہ کر کیا علم پر ان کو شیدا کہ ہیں دور رحمت سے سب اہل دنیا

مگر دھیان ہے جن کو ہر دم خدا کا ہے تعلیم ہی کا سدا جن میں چرچا

انہیں کے لیے یاں ہے نعمت خدا کی

انہیں پر ہے واں جا کے رحمت خدا کی

محمد ﷺ ایک طرف غریبوں و مزدوروں کو حق اور حلال کمائی کی تلقین کرتے ہیں تو دوسری طرف امیروں کو غریبوں پر خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں تاکہ معاشی بحران نہ پیدا ہو جائے اور ایثار و ہمدردی قائم رہے۔ تعصب جیسی بری چیز سے پرہیز کی تعلیم دیتے ہیں۔ حالی ایک حدیث کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں :

ڈرایا تعصب سے ان کو یہ کہہ کر کہ زندہ رہا اور مرا جو اسی پر

ہوا وہ ہماری جماعت سے باہر وہ ساتھی ہمارا نہ ہم اس کے یاور

نہیں حق سے کچھ اس محبت کو بہرا

کہ جو تم کو اندھا کرے اور بہرا

محمد ﷺ کے صحابی محمد ﷺ کی صحبت سے مستفید ہو کر اور گمنامی و بدنامی کی زندگی سے نکل کر تابناکی و نیک نامی کی زندگی گزارنے لگتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات کا اثر ان پر اتنا زبردست ہوا کہ وہ بد اخلاق قوم تہذیب و تمدن کے اعلیٰ معیار تک پہنچ گئی جس کی کوئی مثال نہیں ملتی بلکہ تہذیب و تمدن کا منبع بن گئی جس کی اشاعت پوری دنیا میں بڑے شد و مد سے ہوئی۔

بقول طاہر جمیل :

The effect of this noble teaching of Islam was miraculous. It completely transformed the tribe of fierce bedounins into a race of highly cultured and civilised people, the torch beares of the civilisition and the larning to the west. An era of the conquest began with this metamorphosis of their national character, and the meteoric success of Islam was evident when, within a very short priod, it become the universal religion of practically half of the known world of the time. The success was intirely due to their zeal for spreading truth, to their unity of perpose and divotion to the idiol, to their simplicity of life and man-

ners, to their spirit of democracy and their belief in the equality of man and to their impartial dealing with their subject both muslim and non muslim.(2)

حالی مسدس میں اسلام کے عروج کے کارنامہ کا ذکر کرتے ہیں اور دِکھاتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے اخلاق و معاملات کس طرح کے تھے اور ان تمام اوصاف کو بیان کرتے ہیں جو ان میں تھیں۔ اور اس دور کی حالت، عبد و حر کی اہمیت، ذمی و مسلم کی وقعت، کنیز و باندی کی منزلت وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔ ان اصحاب کی کفایت و سخاوت اور الفت و نفرت بامقصد ہوا کرتی تھی۔ خلافت راشدہ کے بارے میں ذکر کرتے ہیں :

کفایت جہاں چاہئے واں کفایت　　سخاوت جہاں چاہئے واں سخاوت
جچی اور تلی دشمنی اور محبت　　نہ بے وجہ الفت نہ بے وجہ نفرت
جھکا حق سے جو جھک گئے اس سے وہ بھی
رکا حق سے جو رک گئے اس سے وہ بھی

اس کے بعد حالی موجودہ زمانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ آج جس آزادی کا دعوی کیا جارہا ہے۔ وہ سب اسلام کا ہی چربہ ہے۔ اسلام سے پہلے پوری دنیا میں عام تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ نہ تعلیم، نہ تہذیب میں، نہ مادی ترقی اور، نہ روحانی ترقی میں آگے تھے۔ دنیا پر تاریکی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ جب اسلام کی روشنی ان پر پڑی اور اسلام کی روشنی ان کی زندگی میں داخل ہوئی تو ان میں نئی روح پیدا ہوئی۔ اسلامی انوار نے ان کی زندگی کے ہر گوشے کو منور کردیا۔ ورنہ ان قوموں کی حالت کیا تھی۔ یہ وہی قوم ہے جو آج آزادی کی خام خیالی کی باتیں کرتی ہے۔ اگر تاریخ کی ورق گردانی کروگے تو یہ اندازہ ہوگا کہ یہ قوم کیا تھی اور تم کیا تھے ؟ اور نہ صرف یورپ کا یہ حال تھا بلکہ ہندوستان کا بھی حال یہی تھا۔

ترقی کا جس دم خیال ان کو آیا　　اِک اندھیر تھا ربع مسکوں میں چھایا
ہر اک قوم پر تھا تنزل کا سایا　　بلندی سے تھا جس نے سب کو گرایا
وہ نیشن جو ہیں آج گردوں کے تارے
دھندلکے میں پستی کے پنہاں تھے سارے

نہ وہ دور دورہ تھا عبرانیوں کا　　نہ یہ بخت و اقبال نصرانیوں کا
پراگندہ دفتر تھا یونانیوں کا　　پریشاں تھا شیرازہ ساسانیوں کا

جہاز اہل روما کا تھا ڈگمگایا
چراغ اہل ایراں کا تھا ٹمٹماتا

ادھر ہند میں ہر طرف تھا اندھیرا کہ تھا گیان گن کا لدایاں سے ڈیرا
ادھر تھا عجم کو جہالت نے گھیرا کہ دل سب نے کیش دکنش سے تھا پھیرا

نہ بھگوان کا دھیان تھا گیانیوں میں
نہ یزداں پرستی تھی یزدانیوں میں

ہوا ہر طرف موجزن تھی بلا کی گلوں پر چھری چل رہی تھی جفا کی
عقوبت کی حد تھی نہ پرسش خطا کی پڑی لٹ رہی تھی ودیعت خدا کی

زمیں پر تھا ابرِ ستم کا دڑیڑا
تباہی میں تھا نوع انساں کا بیڑا

وہ قومیں جو ہیں آج غمخوار انساں درندوں کی اور ان کی طینت تھی یکساں
جہاں عدل کے آج جاری ہیں فرماں بہت دور پہنچا تھا واں ظلم و طغیاں

بنے آج جو گلہ باں ہیں ہمارے
وہ تھے بھیڑیے آدمی خوار سارے

حضرت عیسیٰؑ کی وفات سے لے کر پانچویں صدی تک کا زمانہ تاریکی کا زمانہ تھا۔ ظلم وبد نظمیاں، جہالت و ضلالت، بد دیانتی وبے ایمانی، تمام قوموں پر غالب تھی۔ نہ صرف یورپ بلکہ ایشیا، امریکہ، آسٹریلیا ہر جگہ گمراہی تھی اسلام کی بدولت ہی عرب نے ہر جگہ روشنی پھیلائی۔ عربی نہ صرف ایک بہترین جنگجو اور سپہ سالار بنے بلکہ بہترین سیاست داں اور بہترین ناظم کے ساتھ ساتھ اور جدید علوم کی بنیاد قائم کرنے والے بھی تھے۔ سائنس، طب، حساب، علوم وفنون سب کی بنیاد انہی کی رکھی ہوئی ہے۔ حالی اسلام کی نشر واشاعت کے بعد احیاء علوم کا ذکر کرتے ہیں اور یاد دہانی کراتے ہیں کہ جو جدید علوم ہیں وہ سب اسلامی علوم سے ماخوذ ہیں۔

ان علوم وفنون کے ذریعہ مسلمانوں نے حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے۔ بلکہ ان کے نشانات آج بھی غموں کو تازہ کرتے ہیں۔ حالی ان آثار الصنادید کی نشاندہی کرتے ہیں جو کسی زمانے میں مسلمانوں کی شان تھی :

جہاں کو ہے یاد ان کی رفتار اب تک کہ نقشِ قدم ہیں نمودار اب تک

ملایا میں ہیں ان کے آثار اب تک　　انہیں رورہا ہے ملیبار اب تک
ہمالہ کو ہیں واقعات ان کے ازبر
نشاں ان کے باقی ہیں جبرالٹر پر

نہیں اس طبق پر کوئی براعظم　　نہ ہوں جس میں ان کی عمارت محکم
عرب، ہند، مصر، اندلس، شام، ویلم　　بناؤں سے ہے ان کی معمور عالم
سر کوہ آدم سے تا کوہ بیضا
جہاں جاؤ گے کھوج پاؤ گے ان کا

وہ سنگیں محل اور وہ ان کی صفائی　　جمی جن کے کھنڈروں پہ ہے آج کائی
وہ مرقد کے گنبد تھے جن کے طلائی　　وہ معبد جہاں جلوہ گر تھی خدائی
زمانے نے گو ان کی برکت اٹھالی
نہیں کوئی ویرانہ پر ان سے خالی

ہوا اندلس ان سے گلزار یکسر　　جہاں ان کے آثار باقی ہیں اکثر
جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جاکر　　یہ ہے بیت حمراء کی گویا زباں پر
کہ تھے آلِ عدنان سے میرے بانی
عرب کی ہوں میں اس زمیں پر نشانی

ہویدا ہے غرناطہ سے شوکت ان کی　　عیاں ہے بلنسیہ سے قدرت ان کی
بطلیوس کو یاد ہے عظمت ان کی　　ٹپکتی ہے قادس میں سر حسرت ان کی
نصیب ان کا اشبیلیہ میں ہے سوتا
شب و روز ہے قرطبہ ان کو روتا

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جاکے دیکھے　　مساجد کے محراب و در جاکے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جاکے دیکھے　　وہ اجڑا ہوا کر و فر جاکے دیکھے
جلال ان کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

وہ بلدہ کہ فخرِ بلادِ جہاں تھا تر و خشک پر جس کا سکہ رواں تھا
گڑا جس میں عباسیوں کا نشاں تھا عراق عرب جس سے رشکِ جناں تھا
اڑا لے گئی بادِ پندار جس کو
بہا لے گئی سیلِ تاتار جس کو

سنے گوشِ عبرت سے گر جا کے انساں تو واں ذرّہ ذرّہ پہ کرتا ہے اعلاں
کہ تھا جن دنوں مہر اسلام تاباں ہوا یاں کی تھی زندگی بخش دوراں
پڑی خاک ایتھنز میں جاں یہیں سے
ہوا زندہ پھر نام یوناں یہیں سے

حالی کا یہ بند اسلامی تاریخ کے زوال کا مرثیہ ہے۔ خلافت عباسیہ میں جن علوم کا چرچا تھا ان سب پر آج زوال آچکا ہے۔ صرف ان کے نشانات باقی رہ گئے ہیں۔ اگر کسی کے اندر ذرا بھی رمق باقی ہے تو ان کھنڈرات کو دیکھ کر اسلام کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ زبان و بیاں میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ فصاحت وبلاغت میں یکتا تھے، دنیا کو انہوں نے تاریخ لکھنے کا فن سکھایا، گفتگو کے انداز بتائے، مدح وذم کا سلیقہ سکھایا۔ غرض کہ کمالات کے وہ جوہر دیکھائے جو اس سے قبل دیکھے نہ سنے تھے۔

عرب شعر بیانی میں کمال درجہ کو پہنچ گئے تھے۔ ان کی تقریروں اور تحریروں سے مبارزوں کے دل بڑھ جاتے تھے اور مخالفوں کے حوصلے پست ہو جاتے تھے۔ ان کے قصائد تیر و سناں کا کام دیتے تھے۔ عرب نہ صرف زباں میں ماہر تھے۔ بلکہ دوسرے علوم و فنون میں بھی بے مثال تھے۔ حالی نے اس کا نقشہ بہت ہی خوبصورتی سے کھینچا ہے اور تواریخ کے بیاں میں بھی روانی کو ملحوظ رکھا ہے۔

زمانہ میں پھیلی طب ان کی بدولت ہوئی بہرہ ور جس سے ہر قوم و ملت
نہ صرف ایک مشرق میں تھی ان کی شہرت مسلم تھی مغرب تک ان کی حذاقت
سلر نو میں جو ایک نامی مطب تھا
وہ مغرب میں عطّار مشکِ عرب تھا

ابوبکر رازی ، علی ابن عیسیٰ حکیم گرامی حسین ابن سینا
حنین ابن اسحٰق قیس دانا ضیاء ابن بیطار راس الاطبّاء

انہیں کے ہیں مشرق میں سب نام لیوا
انہیں سے ہوا پار مغرب کا کھیوا

غرض فن ہیں جو مایۂ دین و دولت　　طبیعی ، الٰہی ، ریاضی و حکمت
طب اور کیمیا ہندسہ اور ہیئت　　سیاحت ، تجارت ، عمارت ، فلاحت
لگاؤ گے کھوج ان کا جاکر جہاں تم
نشاں ان کے قدموں کے پاؤ گے واں تم

ہوا گوکہ پامال بُستاں عرب کا　　مگر اک جہاں ہے غزلخواں عرب کا
ہرا کر گیا سب کو باراں عرب کا　　سپید و سیہ پر ہے احساں عرب کا
وہ قومیں جو ہیں آج سر تاج سب کی
کنوڈی رہیں گی ہمیشہ عرب کی

حالی اس کے بعد تنزل اسلام کا ذکر کرتے ہیں اور یہ احساس دلاتے ہیں کہ یہ وہی قوم ہے جو دنیا میں ایک رتبہ حاصل کر چکی تھی۔ جس کا ماضی تابناک اور شاندار تھا۔ لیکن آج اس قوم کی حالت کیا ہے ؟ جب کہ دوسری اقوام اپنی زندگی کی علامت دکھلا رہی ہیں اور ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ مگر اس قوم کا مستقبل کیا ہوگا جس قوم کی حالت یہ ہے کہ اس کو اپنی تنزلی کا احساس بھی نہیں ہے۔ حالی اس کے زوال کے اسباب بتاتے ہیں کہ :

یہ گدلا ہوا جب کہ چشمہ صفا کا　　گیا چھوٹ سر رشتہ دین ہدیٰ کا
رہا سر پہ باقی نہ سایہ ہُما کا　　تو پورا ہوا عہد تھا جو خدا کا
کہ ہم نے بگاڑا نہیں کوئی اب تک
وہ بگڑا نہیں آپ دنیا میں جب تک

اس کے بعد حالی دیگر اقوام سے مسلمانوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور ان کے زوال کو تمثیل کے ذریعہ بہت ہی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔

ملے کوئی ٹیلہ اگر ایسا اونچا　　کہ آتی ہو واں سے نظر ساری دنیا
چڑھے اس پہ پھر اک خرد مند دانا　　کہ قدرت کے میداں کا دیکھے تماشا
تو قوموں میں فرق اس قدر پائے گا وہ

کہ عالم کو زیر و زبر پائے گا وہ

وہ دیکھے گا ہر سو ہزاروں چمن واں　　بہت تازہ تر خوبصورت باغ رضواں

بہت ان سے کمتر پہ سرسبز و خنداں　　بہت خشک اور بے طراوت مگر ہاں

نہیں لائے گو برگ وبار ان کے پودے

نظر آتے ہیں ہونہار ان کے پودے

پھر اک باغ دیکھے گا اجڑا سراسر　　جہاں خاک اڑتی ہے ہر سو برابر

نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر　　ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر

نہیں پھول پھل جس میں آنے کے قابل

ہوئے روکھ جس کے جلانے کے قابل

جہاں آگ کا کام کرتا ہے باراں　　جہاں آکے دیتا ہے روایز نیساں

تردّد سے جو اور ہوتا ہے ویراں　　نہیں راسن حس کو خزاں اور بہاراں

یہ آواز پیہم وہاں آرہی ہے

کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے

کتنی خوبصورتی سے دیگر اقوام اور مسلمانوں کا تقابل تشبیہ کے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کا اس باغ رعنا میں کیا حال ہے۔ اس کے بعد قوم میں روح پھونکنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان واقعات کو بہت ہی پر درد لہجہ میں بیان کیا ہے۔

اگر کان دھر کے سنیں اہل عبرت　　تو سیلون سے تابہ کشمیر و تبت

زمیں روکھ بن پھول پھل ریت پربت　　یہ فریاد سب کر رہے ہیں بہ حسرت

کہ کل فخر تھا جس سے اہل جہاں کو

لگا ان سے عیب آج ہندوستاں کو

اس کے بعد حالی ہندوستان کے مسلمانوں کے خصائل بیان کرتے ہیں اور یہ احساس دلاتے ہیں کہ ان کی وقعت باقی رہی نہ عزت، وہ نہ علم میں سبقت رکھتے ہیں نہ سیاست میں، یہ مفلوک الحال اور بد حال ہیں۔ ان کے ہاتھ میں نہ تجارت ہے نہ امارت اور نہ وہ روح باقی رہی جس کی بدولت وہ سیاحی کرتے تھے۔ ان کی باتوں میں سفلہ پن ہے۔ نہ توقیر کا خیال ہے نہ نجابت باقی ہے۔ حالی ایک ایک خرابی کو گناتے ہیں اور مرض کو ابھارتے ہیں تاکہ شدت درد سے شاید مریض

اپنا علاج کروانے کی فکر میں لگ جائے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے انحطاط اور تضیع اوقات اور یورپ کی ترقی اور ضبط اوقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

کسی وقت جی بھر کے سوتے نہیں وہ　　کبھی سیر محنت سے ہوتے نہیں وہ
بضاعت کو اپنی ڈبوتے نہیں وہ　　کوئی لمحہ بیکار کھوتے نہیں
نہ چلنے سے تھکتے نہ اکتاتے ہیں وہ
بہت بڑھ گئے اور بڑھے جاتے ہیں وہ

اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ :

مگر ہم کہ اب تک جہاں تھے وہیں ہیں　　جمادات کی طرح بار زمیں ہیں
جہاں میں ہیں ایسے کہ گویا نہیں ہیں　　زمانہ سے کچھ ایسے فارغ نشیں ہیں
کہ گویا ضروری تھا جو کام کرنا
وہ سب کر چکے ایک باقی ہے مرنا

مسلمانوں کو ان صعود و نزول سے کوئی مطلب نہیں اور نہ زمانے کی ترقی سے کوئی سروکار ہے۔ بلکہ زمانے کو بھی اپنے سے کمتر جانتے ہیں۔ اس لیے حالی زمانے کی اہمیت کو بتاتے ہیں کہ اگر زمانے کی پیروی نہ کی جائے تو زمانہ کسی کی پیروی نہیں کرتا۔ فرماتے ہیں کہ :

زمانہ کا دن رات ہے یہ اشارا　　کہ ہے آشتی میں مری یاں گذارا
نہیں پیروی جن کو میری گوارا　　مجھے ان سے کرنا پڑے کنارا
سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

اس کے بعد حالی قوم کی بربادی کے آثار بیان کرتے ہیں۔ نکبت و فلاکت کے اثرات گناتے ہیں۔ زبوں حالی و بد حالی کے وجود بیان کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ افلاس ہی اصل جڑ ہے۔ اسی سے کذب و افترا سیکھتا ہے۔ جب کہ غیر قوموں نے محنت و مشقت کو اپنا مشغلہ بنالیا ہے۔ حالی مسلمانوں کے نفس پر انگلی رکھ کر تشخیص بتاتے ہیں کہ ان کی تباہی کے اسباب کیا ہیں۔ مزدوری سے جی چرانے والے یہ ہیں۔ وقت کو ضائع یہ کرتے ہیں، کام چوری اور تضیع

اوقات، غربت وافلاس کو دعوت دیتی ہے اور امیروں کی حالت یہ ہے کہ وہ مذہب سے بیزار ہیں اور لوگوں کی غربت پر ہنستے ہیں۔ مذہب سے بیزاری اور غریبوں پر بے رحمی، عیاشی وبے حیائی کی طرف لے جاتی ہے۔ ان میں ناانصافی، حسد، بغض، کینہ، تنگ نظری، ہٹ دھرمی جیسی برائیاں بھری ہوئی ہیں اور یہی ان کے تنزل کے اسباب ہیں۔ ان کی فقیری اور بے بسی کو دیکھ کر حالی انہیں جگاتے ہیں اور یاد دلاتے ہیں کہ ان کے بزرگ کون تھے اور یہ کیا بن گئے ہیں؟

امیروں کو آگاہ کرتے ہیں کہ یہ بربادی صرف غرباء وفقراء کی نہیں ہے بلکہ کسی قوم کی بربادی کا آغاز امراء سے ہی ہوتا ہے۔

کسی قوم کا جب الٹتا ہے دفتر　　تو ہوتے ہیں مسخ ان میں پہلے توانگر
کمال ان میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر　　نہ عقل ان کی ہادی نہ دین ان کا رہبر
نہ دنیا میں ذلت نہ عزت کی پروا
نہ عقبیٰ میں دوزخ نہ جنّت کی پروا

دولت وبضاعت جو خدا کی ایک بے بہا نعمت ہے۔ امیر طبقہ اسے اپنی عیش وعشرت میں صرف کررہے تھے۔ رب چاہی زندگی کے بجائے من چاہی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی حالت کو دیکھ کر حالی کو شدید غم ہوتا ہے۔ اس لیے حالی ان کو قرآنی آیات کے ذریعہ جگانے کی کوشش کرتے ہیں:

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا　　کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالق دوسرا کا　　خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

یہ خدائی قانون جو انسان کی فلاح وبہبود کے لیے نازل ہوا ہے۔ جس پر عمل کرنا مسلمانوں کا شعار تھا اور اسی کی وجہ سے وہ ترقی کررہے تھے۔ لیکن آج مسلمان خود اس سے دور ہیں اور دوسرے اس کی پیروی کرتے جارہے ہیں اور یہی ان کی ترقی کا سبب بن رہا ہے۔ لیکن مسلمان اس سے غافل ہیں۔ اس کے بعد حالی اہل یورپ کے اوصاف اور اس کے نتائج بیان کرتے ہیں:

عروج ان کا جو تم عیاں دیکھتے ہو　　جہاں میں انہیں کامراں دیکھتے ہو
مطیع ان کا سارا جہاں دیکھتے ہو　　انہیں برتر از آسماں دیکھتے ہو

یہ ثمرے ہیں ان کے جوانمردیوں کے
نتیجے ہیں آپس کی ہمدردیوں کے

حالی بہت ہی جوش و خروش سے دین اسلام کی حالتِ زار کا بیان کرتے ہیں۔ اہل اللہ، علماء دین، مدعیان علم، مدعیان درویش ہر ایک پر قحط طاری ہے اور سب جھوٹے دعویدار ہیں۔ علماء دین جن کا مقصد اسلامی قوانین اور شریعت کا تحفظ کرنا تھا، اخوت و ہمدردی کے جذبات کو پر کرنا تھا، انصاف و حق گوئی کے لیے اپنی جان کی بازی لگانا تھا وہ آج اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں شق پیدا کر رہے ہیں۔ علمائے زمانہ کا حال بڑے شد و مد سے بیان کرتے ہیں اور احساس دلاتے ہیں کہ مقصد کیا تھا اور کیا کر رہے ہیں :

بڑھے جس سے نفرت وہ تقریر کرنی　　جگر جس سے شق ہوں وہ تحریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی　　مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی
یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

وہ صرف اسی پر قناعت نہیں کرتے ہیں بلکہ ان اخلاق و عادات کا شمار کراتے ہیں جو علمائے زمانہ میں رچ بس گئے ہیں۔ اور ان عوامل کا ذکر کرتے ہیں جن کے سبب علمائے دین نے نہ صرف دین کو مسخ ہی کیا ہے بلکہ اس صورت میں پیش کیا ہے کہ اصل دین ناپید ہو گیا ہے اور تمام بدعات، غیر اسلامی رسم و رواج، بے جا پیری مریدی اور دیگر عیوب ان میں داخل ہو گئے ہیں۔

آگے حالی مسلمانوں کو بیجا تقلید سے آگاہ کراتے ہیں اور حدیث و سنن کی پیروی کی تلقین کرتے ہیں۔ حالی بیان کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں شرک و بدعت، ترک توحید سے پھیلی اور توحید محال پسندی کی وجہ سے چھوٹی کیونکہ لوگ خدا سے لو لگانے کے بجائے اہل اللہ پر بھروسہ کرنے لگے اور انہی کی خوشامد اپنی کامیابی کا سبب سمجھ بیٹھے۔ جس کی وجہ سے شرک و کفر میں مبتلا ہو گئے۔ حالی شرک اور توحید میں فرق واضح کرتے ہیں اور بہت ہی دلچسپ پیرائے میں بیان کرتے ہیں :

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر　　جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر　　کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں　　اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں　　شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

وہ دیں جس سے توحید پھیلی جہاں میں　　ہوا جلوہ گر حق زمین و زماں میں
رہا شرک باقی نہ وہم و گماں میں　　وہ بدلا گیا آکے ہندوستاں میں
ہمیشہ سے اسلام تھا جس پہ نازاں
وہ دولت بھی کھو بیٹھے آخر مسلماں

تعصب کی بابت بیان کرتے ہیں کہ تعصب ایک بری چیز ہے۔ اسی سے عداوت و مخالفت ہوتی ہے۔ اسی کی وجہ سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ مسلمانوں میں فرقہ بندی کی جڑ یہی ہے۔ اسی کی وجہ سے آباد گھر برباد ہو گئے۔ کسی بھی مذہب و ملت میں اسے پسند نہیں کیا جاتا ہے اور اسلام اس کے خلاف ہے۔ لیکن یہ چیز مسلمانوں کی عادت اور اخلاق میں شامل ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ سے سچ اور حق بات دلوں پر اثر نہیں کرتی اور لوگ مخالفت پر اتر آتے ہیں۔ قوم میں اسی وجہ سے نفاق پیدا ہوا ہے۔ اتحاد کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ آج غیر بھی اس کی حالت زار پر تضحیک کر رہے ہیں۔

مسلمانوں کے حالات و اطوار اور ان کے فضائل اور خصائل بیان کرنے کے بعد حالی ایک بار پھر ماضی کی طرف جاتے ہیں اور اسلامی تاریخ کی طرف لے جا کر یاد دہانی کراتے ہیں کہ ان میں الفت و محبت کس قدر تھی۔

وہ دیں جس نے الفت کی بنیاد ڈالی　　کیا طبع دوراں کو نفرت سے خالی
بنایا اجانب کو جس نے موالی　　ہر اک قوم کے دل سے وحشت نکالی
عرب اور حبش ترک و تاجیک و ویلم
ہوئے سارے شیر و شکر مل کے باہم

لیکن تعصب نے اس شفاف چشمہ کو بغض و نفاق سے مکدر کر دیا۔ حق تو یہ تھا کہ ہم فریضہ اسلام کا حق ادا کرتے اور تفریق کو ختم کرتے۔

اگر بھولتے ہم نہ قولِ پیغمبرؐ　　کہ ہیں سب مسلمان باہم برادر
برادر ہے جب تک برادر کا یاور　　معین اس کا خود ہے خداوند یاور

تو آتی نہ بیڑے پہ اپنے تباہی
فقیری میں بھی کرتے ہم بادشاہی

خباثت نفس کا یہ عالم ہے کہ اس زبوں حالی سے کوئی نکالنے کی صورت اختیار کرتا ہے تو اسے ہمدردی اور امداد کے بجائے اس پر تبرا کرتے ہیں اور طرح طرح کے الزامات اور بہتان لگاتے ہیں۔ مطلبی و خود غرضی گردانتے ہیں۔ حالی مسلمانوں کی بدنامی ورسوائی، خوشامد، کذب و مبالغہ اور خود پسندی کا ذکر کر کے ان کو ان کی اصلی صورت دکھانا چاہتے ہیں اس بیان کے بعد حالی پھر ایک بار ان کو اسلاف کے کارنامے گناتے ہیں اور خلفاء راشدین کی انصاف پسندی کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ حق بات قبول کرنے والے تھے۔ چہ جائیکہ وہ دل کو ناگوار ہی لگے اور حق پھیلانے میں وہ ہمیشہ مصروف رہتے تھے۔ حالی واقعات کی روشنی میں قوم میں نئی روح ڈالنا چاہتے ہیں۔ خلفاء کی انصاف پسندی کے ذکر میں وہ یوں رطب اللسان ہیں :

وہ عہد ہمایوں جو خیر القروں تھا　　خلافت کا جب تک کہ قائم ستوں تھا
نبوت کا سایہ ابھی رہنموں تھا　　سماں خیر و برکت کا ہر دم قروں تھا
عدالت کے زیور سے تھے سب مزین
پھلا اور پھولا تھا احمدؐ کا گلشن
سعادت بڑی اس زمانہ کی یہ تھی　　کہ جھکتی تھی گردن نصیحت پہ سب کی
نہ کرتے تھے خود قولِ حق سے خموشی　　نہ لگتی تھی حق کی انہیں بات کڑوی
غلاموں سے ہو جاتے تھے بند آقا
خلیفہ سے لڑتی تھی اک ایک بڑھیا

حالی مسلمانوں کے سامنے آئینہ پیش کرتے ہیں اور ان کی تصویر ان کو دکھاتے ہیں تاکہ اپنی حالت کو وہ اصلی صورت میں دیکھ سکیں اور جس چیز پر ان کو رعونت ہے وہ واضح ہو جائے۔ اس لیے حالی ان کے علم و حکمت کے فقدان کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ علم و حکمت کے نام پر جو کچھ ان کے پاس باقی ہے وہ بری حالت میں ہے اور وہ قصہ پارینہ و دیرینہ ہو چکا ہے۔ جس میں نہ کوئی جودت ہے نہ قوت، اگر ان میں سے (مسلمانوں میں) کوئی علم حاصل کرتا ہے تو وہ اپنے کو بہت قابل سمجھتا ہے۔ حالانکہ ان کے علم سے نہ دنیوی فائدہ ہے نہ اخروی، پھر بھی اس پر وہ بہت نازاں ہے۔ حالی ان علماء سے مخاطب ہو کر ان کے علم کی حقیقت کا بیان کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ :

جو پوچھو کہ حضرت نے جو کچھ پڑھا ہے　　　مراد آپ کی اس کے پڑھنے سے کیا ہے
مفاد اس میں دنیا کا یا دین کا ہے　　　نتیجہ کوئی یا کہ اس کے سوا ہے

تو مجذوب کی طرح سب کچھ بکیں گے
جواب اس کا لیکن نہ کچھ دے سکیں گے

نہ حجّت رسالت پہ لا سکتے ہیں وہ　　　نہ اسلام کا حق جتا سکتے ہیں وہ
نہ قرآن کی عظمت دکھا سکتے ہیں وہ　　　نہ حق کی حقیقت بتا سکتے ہیں وہ

دلیلیں ہیں سب آج بیکار ان کی
نہیں چلتی توپوں میں تلوار ان کی

حالی مسلمانوں کی بے مقصد محنت ومشقت پر نالاں ہیں جس کا حاصل کچھ نہیں۔ حالی کئی طرح کی مثال دے کر یہ بات سمجھاتے ہیں کہ اگر ہماری صلاحیتیں صحیح راہ پر خرچ نہیں ہوئیں تو یوں ہی بے کار چلی جائیں گی۔ ان کی مثال اس بھیڑ کی سی ہے جو راستہ بھول گیا ہو لیکن بے سمت چلا جا رہا ہو۔ اسے کچھ پتہ نہیں کہ کہاں جا رہا ہے۔ یا ان کی مثال ایک بندر کی سی ہے جو رات بھر لاحاصل محنت کرتا ہے۔

اس پر غضب یہ کہ جب کوئی ان کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ غور کرنے کے بجائے ان پر غراتے ہیں اور انہیں اپنا دشمن سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اطباء زمانہ کا حال یہ ہے کہ وہ فرسودہ علوم پر ہی نسخہ تیار کرتے ہیں اور فرسودہ علوم کے علاوہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں اسلاف کی کتابوں کو صحیفہ سمجھتے ہیں اور شعر و ادب کا حال بھی اس سے کچھ کم نہیں ہے۔ اس میں اسی رفتار سے زوال آیا ہے۔ وہ شاعری جو پژمردگی میں قوت بخشی تھی۔ وہ کذب و غلو کا دفتر بن گئی ہے۔ وہ عرب کی شاعری کے نتائج بیان کرتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے عہد کے شعراء کا موازنہ بھی کرتے ہیں :

عرب جو تھے دنیا میں اس فن کے بانی　　　نہ تھا کوئی آفاق میں جن کا ثانی
زمانے نے جن کی فصاحت تھی مانی　　　مٹادی عزیزوں نے ان کی نشانی

سب ان کے ہنر اور کمالات کھو کر
رہے شاعری کو بھی آخر ڈبو کر

ادب میں پڑی جان ان کی زباں سے　　　جِلا دین نے پائی ان کے بیاں سے
سناں کے لیے کام انہوں نے لساں سے　　　زبانوں کے کونچے تھے بڑھ کر سناں سے

ہوئے ان کے شعروں سے اخلاق صیقل
پڑی ان کے خطبوں سے عالم میں ہلچل

ہندوستانی شعراء کی نوعیت یہ ہے کہ :

خلف ان کے یاں جو کہ جادو بیاں ہیں　　فصاحت میں مقبول پیر و جواں ہیں
بلاغت میں مشہور ہندوستاں ہیں　　وہ کچھ ہیں تو لے دیکے اس گوں یہاں ہیں

کہ جب شعر میں عمر ساری گنوائیں
تو بھانڈ ان کی غزلیں مجالس میں گائیں

طوائف کو ازبر ہیں دیوان ان کے　　گویوں پہ بیحد ہیں احسان ان کے
نکلتے ہیں تکیوں میں ارمان ان کے　　ثناخواں ہیں ابلیس و شیطان ان کے

کہ عقلوں پہ پردے دیے ڈال انہوں نے
ہمیں کر دیا فارغ البال انہوں نے

حالی اب اشرافیہ طبقے کی اولاد کی طرف ذہن مبذول کراتے ہیں جن سے کچھ امید وابستہ کی جاسکتی ہے۔ لیکن ان کی حالت بھی دیکھ کر رنجیدہ اور غمگین ہو جاتے ہیں اور شدید غم کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی تربیت کی جانب سے لاپرواہی پر تبرات کرتے ہیں۔ اور ان کی بری حالتوں اور اخلاق کی گراوٹ کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کی اولاد علم و عمل سے کوسوں دور ہوتی جارہی ہے۔ ان کی تفریح گاہ، میلے اور ناچ گانے ہوا کرتے ہیں۔ ذرا بڑے ہوئے کہ جوانی کی بھوت سوار ہو جاتی ہے اوا پنی تمام قوتیں فضولیات میں صرف کرنے لگتے ہیں۔ حالی ان کی تمام برائیوں کا بیان کرتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ کیا ہم انہی سے یہ توقع رکھیں کہ یہ پژمردہ باغ کو شاداب کریں گے۔ جن کی خصلتیں خراب تر ہیں اور جن کے اعمال خراب ہوتے جارہے ہیں۔ حالی بڑے دردانگیز انداز میں یہ سوال کرتے ہیں :

وہ اسلام کی پود شاید یہی ہے　　کہ جس کی طرف آنکھ سب کی لگی ہے
بہت جس سے آیندہ چشم بہی ہے　　بقا منحصر جس پہ اسلام کی ہے

یہی جان ڈالے گی باغ کہن میں ؟
اسی سے بہار آئے گی اس چمن میں ؟

یہی ہیں وہ نسلیں مبارک ہماری ؟　　کہ بخشیں گی جو دین کو استواری

کریں گی یہی قوم کی غمگساری　　انہیں پر امیدیں ہیں موقوف ساری

یہی شمع اسلام روشن کریں گی

بڑوں کا یہی نام روشن کریں گی

اور جو لوگ مغربی علم کے دلدادہ ہیں وہ مغربی شعار و طریقہ میں اس طرح غرق ہیں گویا نشے مے خوار و بد حواس ہیں اور یہ بد حال مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور اگر ان میں تھوڑا بہت مغربی علم آگیا تو اس پہ بہت نازاں ہیں۔ حالی اس تعلیم یافتہ طبقے کی حالت کا بیان کرتے ہیں۔

اگلے بند میں حالی عام مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہیں اور ایک کشتی کی مثال سے بات سمجھاتے ہیں۔ جن میں پڑھا بے پڑھا، بوڑھا جوان، اسلاف و اجلاف، باہوش و مدہوش، دانا و ناداں، سبھی سوار ہیں اور کشتی طوفانی گرداب میں پھنس گئی ہے اور جو عقلمند ہیں وہ تماشائیں ہیں حالی ان کو جھنجھوڑتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ :

جہاز ایک گرداب میں پھنس رہا ہے　　پڑا جس سے جو کھوں میں چھوٹا بڑا ہے

نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے　　کوئی ان میں سوتا کوئی جاگتا ہے

جو سوتے ہیں وہ مستِ خواب گراں ہے

جو بیدار ہیں ان پہ خنداں زناں ہیں

کوئی ان سے پوچھے کہ اے ہوش والو　　کس امید پر تم کھڑے ہنس رہے ہو

برا وقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو　　نہ چھوڑے گا سوتوں کو اور جاگتوں کو

بچو گے نہ تم اور نہ ساتھی تمہارے

اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

حالی ان کے حالات دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوتے ہیں اور تاسف سے یہ کہتے ہیں کہ :

مریض ایسے مایوس دنیا میں کم ہیں　　بگڑ کر کبھی جو نہ سنبھلیں وہ ہم ہیں

شاعر اس نکتے کی وضاحت ایک حدیث کی مدد سے کرتا ہے۔

کسی نے یہ اک مرد دانا سے پوچھا　　کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا

کہا "عقل جس سے ملے دین و دنیا"　　کہا "گر نہ ہو اس سے انساں کو بہرا"

کہا "پھر اہم سب سے علم و ہنر ہے"

کہ جو باعثِ افتخارِ بشر ہے"

کہا "گر نہ ہو یہ بھی اس کو میسر" کہا "مال و دولت ہے پھر سب سے بڑھ کر

کہا "در ہو یہ بھی اگر بند اس پر" کہا "اس پہ بجلی کا گرنا ہے بہتر"

وہ ننگ بشر تاکہ ذلت سے چھوٹے

خلائق سب اس کی نحوست سے چھوٹے

مسلمانوں کی غفلت کے بعد انگریزی حکومت کی خیر و برکت کا ذکر کرتے ہیں اور مسلمانوں کی ترقی کی راہ پر لانے کی کوشش کرتے ہیں انہیں جگانے کی سعی کرتے ہیں۔ ان کو احساس دلاتے ہیں کہ ڈوبنے سے پہلے ایک بار سوچو اور دیکھو کہ لوگ کہاں پہنچ گئے اور تم کہاں ہو؟ اس حکومت کی برکات کی راہیں کھلی ہیں۔ صرف قدم رکھنے کی دیر ہے اور ہر طرف امن و اماں کی صدا آرہی ہے۔ اس موقع سے تم بھی فائدہ اٹھاؤ۔ تم بھی ترقی کی راہ پر قدم رکھو اور یقین جانو کے تمہارے مذہب و ملت کو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے اگر خطرہ ہے تو وہ تمہارے کردار سے ہے۔ تم جہاں چاہو آذان دو اور جہاں چاہو نماز پڑھو کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ تجارت کی، صنعت و حرفت کی، تحصیل حکمت کی، کسب دولت کی، سب کے لیے اس حکومت میں در کھلا ہے۔ اے میری قوم کے لوگوں اٹھوں اور آگے بڑھو، دیکھو تمہارے ساتھی بہت آگے نکل گئے ہیں۔ درا کی آواز آرہی ہے۔ تم بھی اس قافلے میں شریک ہو جاؤ اور بھلا دو ان جھوٹی کہانیوں کو۔ اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے زمانے کی طرف مڑتے ہیں اور زمانے کی حقیقت سے آگاہ کراتے ہیں کہ تم کب تک فارغ البال رہو گے؟ کب تک بھیڑ کی چال چلو گے؟ کب تک اپنی اولادوں کو برباد کرو گے؟ کب تک تعصب کے شعلے بھڑکاؤ گے؟ اب تو خاموش ہو جاؤ اور سیدھے راستے پر لگ جاؤ ابھی وقت ہے آنکھیں کھولو اور دیکھو زمانہ کتنا آگے نکل چکا ہے اور تمہارے ساتھی کہاں پہنچ گئے ہیں مگر تم ضد پر اڑے ہو۔ اپنی حالت پر غور کرو، ناصح کی باتوں کو مانو، اپنے دوستوں کو بدخواہ مت جانو، بلکہ اٹھو اور بدلو اپنے آپ کو کیونکہ اب تم سب سن چکے تمہارے سامنے حقیقتیں روشن ہوں گئیں۔

اس کے بعد زمانے کی عروج و زوال کی داستان سناتے ہیں کہ زمانے سے لاپرواہی کرنے پر زمانہ کسی کو نہیں چھوڑتا۔ اہرام بنانے والے خاک میں مٹ گئے اور بہت سے باغ اجڑ گئے اور بہت سی قومیں غارت ہو گئیں۔ اگر تم نہیں بدلو گے تو تمہارا بھی انجام وہی ہو گا اور آخری بند میں ثابت کرتے ہیں کہ بقا تو صرف خدا کے لیے ہے جو کچھ ہے سب فانی ہے یہ فطرت کا دستور ہے کہ ہر ترقی کو زوال ہے۔

یہ طویل نظم ۲۹۷ بند پر مشتمل ہے۔اس نظم میں حالی مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذمہ دار مذہبی اور سیکولر دونوں رہنماؤں کو ٹھہراتے ہیں۔ کیونکہ یہی لوگ مسلمانوں کو کبھی مذہب اور سیاست کے نام پر ان کو ان کے غلط رہنمائی کی ہے۔ حالی سب سے اپیل کرتے ہیں سب مل جل کر ان مسائل کو حل کریں اور انگریزی حکومت کے ظل حمایت میں اپنی طاقت کو بڑھائیں وہ مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ اپنی صلاحیت کو تلف مت کرو، صحیح جگہ پر استعمال کرو اور اپنی ترقی کا راستہ متعین کرو اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ فراموش کردو ان فرسودہ کہانیوں کو، بھلادو ایسے کارناموں کو جو تمہارے کام نہ آئے اور اس غبار کو ہٹاؤ جس میں اصل مذہب دب گیا ہے اور ان امیروں اور مذہبی رہنماؤں پر حالی تنقید کرتے ہیں جو یا تو تماشا دیکھ رہے ہیں یا انہیں تباہ کر رہے ہیں۔ امراء اور مذہبی رہنما خود ستائی و خود نمائی میں مصروف ہیں اور اپنی خوسری سے بعض بھی نہیں آتے اور قوم خواب غفلت میں پڑی ہے ان کے سر پر ہلاکت کے بادل منڈلا رہے ہیں اور یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ کب بجلی گرے اور یہ ہلاک ہو جائے۔ حالی یہ منظر سناتے ہیں اور قوم کو جگانے کی کوشش کرتے ہیں۔بقول صالحہ عابد حسین کہ :

> اس میں شک نہیں کہ حالی کے پیش نظر مسلمانوں کی حالت زار تھی اور ان کی اصلاح ان کا مقصد اول تھا۔ لیکن وہ ان کے عروج و زوال کی جو داستان پیش کرتے ہیں وہ تاریخ عالم کا ایک روشن اور عبرت انگیز حصہ ہے اور اس کا مطالعہ انسان کی تہذیبی میراث کا جزو ہے۔ جو صرف مسلمان ہی کے لیے نہیں بلکہ سب قوموں کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ کیونکہ قومی عروج و زوال کے جو اصول اور اسباب اس میں سمجھائے گئے ہیں ان کا اطلاق عام ہے۔ اس کے علاوہ جن قدروں کو انہوں نے پیش کیا ہے اور جس انداز میں پیش کیا ہے وہ بھی زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں۔ محنت، اکل حلال، دیانت داری، اخوت، انصاف، سماجی برابری، علم کا احترام، دولت اور نام و نسب کی بے جا پاسداری کے خطرے یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جن کا سمجھنا ہر قوم کے لیے ضروری ہے۔ اگر ان کو کسی خاص قوم یا مذہب کی اصطلاحوں میں بیان کیا جائے (اور بر خلاف اقبال کے حالی کے یہاں تو اصطلاح بھی بہت کم ہیں اور ان کی شاعری کی زبان عالمگیر زبان ہے۔) تو اس سے ان کی قدریں کم نہیں ہو جاتیں۔(۳)

پوری نظم میں زبان و بیان کی وہ چستی ہے کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے اور پوری نظم میں ایک بھی ایسا بند نہیں ہے جو بے مصرف یا بے معنی ہو بلکہ ہر بند ایک دوسرے سے اتنا مربوط ہے کہ اگر درمیاں سے کوئی حصہ نکال دیا جائے تو پوری نظم بے ربط ہو جائے گی۔ حالی اس نظم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ :

> ”اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اول عرب کی اس حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو

ظہورِ اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زباں میں جاہلیت رکھا گیا۔ پھر کوکب اسلام کا طلوع ہونا اور نبی امی کی تعلیم سے ریگستان کا دفعتاً سرسبز و شاداب ہو جانا اور اس ابرِ رحمت کا امت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی و دنیوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے تنزل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں اگر وہ اپنے خد و خال دیکھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔"(۴)

اس طویل مسدس کی مقبولیت اور شہرت اتنی ہوئی کہ چاروں طرف سے درد و فریاد کی صدا آنے لگی۔ حالی اس کا خود اعتراف کرتے ہیں :

"مسدس مد و جزر اسلام اول ہی اول ۱۲۹۶ھ میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اگر اس نظم کی اشاعت سے شاید کوئی معتد بہ فائدہ سوسائٹی کو نہیں پہنچا مگر چھ برس میں جس قدر قبولیت یا شہرت اس نظم کو اطراف ہندوستان میں ہوئی وہ فی الواقع تعجب انگیز ہے۔"(۵)

اس کی صدا اتنی گونجی کہ ہر جگہ ایک ہی آواز سنائی دینے لگی اور ہر جگہ ایک ہی درد اٹھنے لگا۔ باوجود اس کے کہ اس نظم میں اکثر لعن و طعن ہے قوم کی خرابیاں چن چن کر گنائی گئی ہیں۔ زبان میں تیغ و سنان کی تیزی ہے۔ لیکن اس میں ایک درد تھا، اس میں ہمدردی تھی، اس میں قوم کا غم تھا، اس میں مذہب و ملت کا مرثیہ تھا، کہ پڑھنے والے اپنے گریبان میں جھانکتے اور روتے۔ اس کا اسلوب اس قدر غیرت دلانے والا تھا کہ بے غیرتوں کو بھی غیرت آتی تھی۔ اس کی شہرت و مقبولیت کے بارے میں حالی تحریر فرماتے ہیں :

"یہ نظم ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔ ہندوستان کے مختلف اضلاع میں اس کے سات آٹھ ایڈیشن اب سے پہلے چھپ چکے ہیں۔ بعض قومی مدرسوں میں اس کا انتخاب بچوں کو پڑھایا جاتا ہے۔ مولود شریف کی مجلسوں میں جابجا اس کے بند پڑھے جاتے ہیں اکثر لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روتے ہیں اور آنسو بہاتے ہیں۔ اس کے بہت سے بند ہمارے واعظوں کی زباں پر جاری ہیں۔ کہیں کہیں قومی ناٹک میں اس کے مضامین ایکٹ کئے جاتے ہیں۔ بہت سے مسدس اسی کی روش اسی بحر میں ترتیب دیئے گئے ہیں۔ شمالی مغرب کے اضلاع کے سرکاری مدارس میں عام مقبولیت کی وجہ سے اس کو تعلیم میں داخل کیا گیا ہے یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نے اس کی طرف کافی توجہ کی ہے۔ مگر مصنف کو کچھ فخر کرنے کا محل نہیں ہے۔"(۶)

اس طویل مسدس کے بعد حالی اسی بحر میں ایک ضمیمہ مسدس میں لکھتے ہیں جس کو اس مسدس میں لاحق کر کے

۱۸۸۶ء میں شائع کیا گیا۔ اس میں قوم کی عبرت کا بیان ہے جس سے امید کی کرن پھوٹتی ہے اور امکان ترقی سے شروع ہو کر دعا پر ختم ہوتی ہے۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

بس اے نا امیدی نہ یوں دل بجھا تو　　جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو
ذرا نا امیدوں کی ڈھارس بندھا تو　　فسردہ دلوں کے دل آخر بڑھا تو

ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں

اس میں ۶۲ ابند ہیں۔ جس میں حسب ذیل موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔

امکان ترقی، آغاز ترقی، اقبال بندی کیا چیز ہے، محنت پسندی، کاہلی کی مذمت، محنت کی شرافت، غم خواری، علم کی فضیلت، جدید علوم کے نتائج، حلال کمائی کی برکت اور ترغیب، اسلاف کی تعلیمی کوششیں، دار العلوم اسلامیہ کا بیان اور اس کی اہمیت و مقام، تعلیم سے بے توجہی کے نتائج کا بیان، علوم و فنون کی ترغیب، اس کی اہمیت و مقبولیت کا بیان وغیرہ جیسے مضامین کو پیش کیا گیا۔ ان تمام چیزوں کے لیے اتفاق و اتحاد کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ حالی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگر سب مل جل کر کام کریں تو یہ تمام تاریکیاں دور ہو جائیں گی اور مفتوحات کا دروازہ کھل جائے گا۔ اس کی مثال چیونٹیوں سے دیتے ہیں۔

ذخیرہ ہے جب چیونٹا کوئی پاتا　　تو بھاگا جماعت میں ہے اپنے آتا
انہیں ساتھ لے لیکے ہے یاں سے جاتا　　فتوح اپنی ایک ایک کو ہے دکھاتا

سدا ان کے ہیں اس طرح کام چلتے
کمائی سے اک اک کی لاکھوں ہیں پلتے

چیونٹیوں کی مثال کے ذریعہ یہ ترغیب دیتے ہیں کہ جس میں نہ دانش ہے نہ حکمت وہ اپنی قوم کی فکر کرتی ہیں اور انسان تو اشرف المخلوقات ہیں۔ متفقہ کوشش کی ترغیب دینے کے بعد آخر میں نظم کو اس دعا پر ختم کرتے ہیں :

الٰہی بحقِّ رسول تہامی　　ہر اک فرد انساں کا تھا جو کہ حامی
جسے دور و نزدیک تھے سب گرامی　　برابر تھے مکی و زنگی و شامی

شریروں کو ساتھ اپنے جس نے بنایا
بڑوں کا ہمیشہ بھلا جس نے چاہا

طفیل اس کا اور اس کی عزت کا یارب　　پکڑ ہاتھ جلد اس کی امت کا یارب
اک ابر اس پہ بھیج اپنی رحمت کا یارب　　غبار اس سے جو دھودے ذلت کا یارب

کہ ملت کو ہے ننگ ہستی سے اس کے
ہوا پست اسلام پستی سے اس کے

انہیں کل کی فکر آج کرنا سکھا دے　　ذرا ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھا دے
کمیں گاہ بازی دوراں دکھا دے　　جو ہونا ہے کل آج ان کو سجھا دے

چھتیں پاٹ لیں تاکہ باراں سے پہلے
سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے

بچا ان کو اس تنگنائے بلا سے　　کہ رستہ ہو گم رہرو و رہنما سے
نہ امید باری ہو یار آشنا سے　　نہ چشم اعانت ہو دست و عصا سے

چپ وراست چھائی ہوئی ظلمتیں ہوں
دلوں میں امیدوں کی جا حسرتیں ہوں

اس نظم کا جائزہ لیتے ہوئے محترمہ صالحہ عابد حسین فرماتی ہیں :

''اس (حالی) نے قوم کی بدحالی، پستی، اخلاقی گراوٹ، جہالت اور بے عملی کا عبرت انگیز منظر دیکھا یا کہ ہر غیرت مند دل شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے اور اپنی اور قوم کی حالت پر شاعر کے ساتھ خون کے آنسو روتا نظر آتا ہے۔ قوم کے ہر طبقے اور ہر فرقے کی حالت کی مکمل تصویر آنکھوں میں بھرنے لگتی ہے اور ہر ایک اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر شرم سے سر جھکا لیتا ہے۔ آخر میں ایک صاحب نظر فن کار کی ناامیدی میں امید کی کرن چمکا کر، محنت کی عظمت، عمل کی برکت سمجھا کر علم و عمل کے میدان میں قدم بڑھانے کا حوصلہ باندھ کر، بارگاہ الٰہی میں قوم کے لیے دعا کرتے ہوئے شاعر رخصت ہو جاتا ہے۔''(۷)

حالی کا فکری اور نظریاتی رویہ

(بحوالہ مسدس)

سر سید، نذیر احمد، شبلی اور حالی بنیادی طور پر اسلامی ترقی کے حامی تھے اور مسلمانوں کی ترقی کے لیے کوشاں تھے۔ چند نظریاتی نااتفاقی کے باوجود اس بات پر متفق تھے کہ مسلمانوں کی ترقی پر امن ماحول میں ہی ہو سکتی ہے اور پر امن ماحول کے لیے انگریزی حکومت کی حمایت ضروری ہے۔ اس لیے ان دانشوروں کے یہاں برطانوی حکومت کے ساتھ وفاداری برتنے پر زور ملتا ہے۔ (شبلی کو چھوڑ کر) اور ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ مسلمانوں کی پس ماندگی کا سبب جدید تعلیم سے ناواقفیت ہے۔ اس لیے تعلیمی سرگرمیوں کو تیز کرنے کی بھی کوششیں کرتے ہیں۔

برطانوی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے سر سید، نذیر احمد اور حالی اس حکومت سے قبل کی حکومتوں کو مطلق العنان حکومتیں قرار دیتے ہیں جس میں آزادی رائے کا کوئی دخل نہیں تھا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں قومی سیاسی شعور میں بیداری اور قومی تحریکیں وجود میں آئیں۔ جن کا مقصد ملک میں سیاسی تعلیم کی نشر و اشاعت اور سیاسی بیداری کو فروغ دینا تھا۔ انہیں مقصد کے حصول کے لیے کانگریس کا قیام عمل میں آیا جس کا اصل مقصد سیاسی بیداری پیدا کرنا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں جب سر یندناتھ بنرجی انڈین ایسوسی ایشن کی دوسری نیشنل کانفرنس میں اپنی مصروفیات کی بنا پر اس میں شریک نہیں ہو سکے لیکن انہوں نے سر سید کو اس میں شامل ہونے کی دعوت دی اور کہا کہ ان کی شرکت کے بغیر کانگریس کا اجلاس نامکمل رہے گا۔ لیکن سر سید کچھ مصلحت کے بنا پر کانگریس میں شریک نہیں ہوئے بلکہ کانگریس کے خلاف ایک الگ ایسوسی ایشن قائم کیا اور انگریزوں کے ساتھ وفاداری کے لیے ایک قرارداد ۳۰ر دسمبر ۱۸۹۳ء میں تیار کیا گیا جس میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا اور مسلمانوں کو موجودہ بحران سے نکالنا مقصد تھا۔ اس قرارداد کے مقاصد یہ تھے کہ :

(الف) مسلمانوں کے خیالات انگریزی عوام اور حکومت ہند کے حضور پیش کر کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا۔

(ب) مسلمانوں میں عام پولیٹیکل ایجی ٹیشن (Political agitation) کو پھیلنے سے روکنا اور ان اقدام

کی حمایت کرنا جو برطانوی حکومت کے استحکام اور اس کی حفاظت کے لیے معاون ہوں۔

(ج) ہندوستان میں امن وامان بحال کرنے کی کوشش کرنا اور عوام میں وفاداری کے جذبات پیدا کرنا۔(۸)

سر سید چونکہ ۱۸۵۷ء کے بغاوت کے نتائج دیکھ چکے تھے اس لیے وہ قوم کی ترقی کے لیے انگریزوں سے مفاہمت کو ضروری سمجھا اور اسی کے لیے وہ کوشش کرتے رہے۔ چونکہ انگریزوں سے مفاہمت کے لیے ضروری تھا کہ انگریزی زبان و تہذیب سے واقفیت حاصل ہوں۔ اس لیے سر سید انگریزی تعلیم کی طرف عوام کا ذہن مبذول کرائیں۔

اس دور کے دوسرے اہم دانشور نذیر احمد ہیں۔ نذیر احمد بھی کانگریس کی مخالفت مسلمانوں کے لیے مستفید سمجھتے تھے۔ لیکن ان کا خیال سر سید کے خیال سے منفرد تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ کانگریس انگریزوں کے خلاف ذاتی مفاد کی وجہ سے ہے نہ کہ قومی مفاد کی وجہ سے، وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کانگریس جدید تعلیم یافتہ بے روزگار اور محروم لوگوں کی جماعت ہے۔ یہ افراد اس لیے برطانوی حکومت کی مخالفت پر آمادہ ہیں کہ جدید تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی ان کی تمنائیں پوری نہیں ہوئیں اور یہ محروم ہی ہیں۔ دوسرا نظریہ یہ تھا کہ مختلف قوموں کو متحد کرنا نامناسب ہے کیونکہ ان کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں اس لیے نیشنل لفظ ہی مغالطے میں ڈالتا ہے۔ چونکہ ۱۸۵۷ء میں ہندوؤں کے رول سے انکا ذہن متنفر ہو گیا تھا۔ کیونکہ چربی لگے کارتوس پر بگڑے تو ہندو مگر آخر کار ہندوؤں کے آٹے کے ساتھ مسلمانوں کا گھن بھی پس گیا۔ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ برطانوی حکومت کے ماتحت ہندوستانی معاشرے کے جن میدانوں میں ترقی ہوئی وہ اس سے پہلے کبھی وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ نذیر احمد یہ بھی تسلیم کر چکے تھے کہ انگریز برسر اقتدار ہو چکے ہیں اور ان کی حکومت مضبوط ہو چکی ہے۔ اس لیے ان کی مخالفت درست نہیں بلکہ مسلمانوں کو مذہبی رو سے ان کی حکومت تسلیم کر لینے کی دعوت دی اور ایک اچھے مسلمان ہونے کی وجہ سے اپنی اسلامی فریضہ حکومت کی اطاعت میں ادا کریں۔ وہ قرآنی آیات کی روشنی میں یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ صاحبِ حکومت کا بھی حکم مانو۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ "جب خدا نے انگریزوں کو ملک پر تسلط کر دیا اور ہم نے رعایا بن کر اس ملک میں رہنا اختیار کیا تو اس کے یہی معنی ہیں کہ ہم میں اور انگریزوں میں ایک طرح کا معاہدہ ہو گیا کہ انگریز حاکم ہونے کی حیثیت سے ہمارے حقوق کی حفاظت کریں اور ہم رعایا ہونے کی حیثیت سے ان کی اطاعت کریں۔(۹)

ان حالات کے پیش نظر سر سید کا نظریہ تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کا ایک ہی آسان راستہ ہے وہ ہے جدید تعلیم کا حصول، اگر مسلمان کانگریس کی سرگرمیوں میں گرفتار ہو گئے تو یہ اور پس ماندہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس وقت مسلمان ہندوؤں کے مقابلے تعلیمی اور سیاسی اعتبار سے بہت پیچھے تھے۔ اس لیے سر سید نے مسلمانوں کو کانگریس سے علاحدگی

اختیار کرنے کا مشورہ دیا اور حصول تعلیم پر زور دیا۔ کیونکہ ان کا یقین تھا کہ اس کے ذریعہ وہ اعلیٰ ملازمتیں حاصل کر سکتے ہیں اور سیاسی و اقتصادی زبوں حالی سے نکل سکتے ہیں۔ سر سید اور نذیر احمد دونوں نے ہی طبقہ اشرافیہ کے مفادات کو ملحوظ رکھا ان کا خیال تھا کہ اگر طبقہ اشرافیہ برسر اقتدار ہو جائے گا تو ان کے ماتحت بھی اپنی پس ماندگی سے اوپر اٹھ جائیں گے۔ لیکن حالی نے کانگریس کی مخالفت نہیں کی۔ وہ اصلاً مسلمانوں کی ترقی چاہتے تھے۔ انگریزوں کے غلام بن کر رہنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کے لیے اس وقت حالات سازگار نہیں تھے کہ وہ انگریزوں کی مخالفت کر سکیں بلکہ ترقی کے لیے ان کی حمایت کو انہوں نے ضروری سمجھا۔ ان کے یہاں ''شکوہ ہند'' اور ''حب وطن'' میں انگریز مخالف رجحانات ملتے ہیں۔ انہوں نے برطانوی حکومت کی مکمل حمایت نہیں کی بلکہ ان اصلاحی اور ترقیاتی اقدام کی تعریف ضرور کی جو ترقی کا باعث بن سکتے ہیں۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبودی صرف برطانوی حکومت ہی کے تحت ممکن ہے بلکہ ان کا خیال تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کے فرقہ وارانہ اتحاد اور ہم آہنگی اور دیسی حکومت کے تحت بھی ممکن ہو سکتی ہے۔

وہ اس بات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے حکومت سے برطرف ہونے کا سبب یہ بھی تھا کہ مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات کو چھوڑ دیا تھا اور جدوجہد سے فرار اختیار کر لیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں صنعت و حرفت کے ساتھ حکومت بھی چلی گئی اس لیے وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ صنعت و حرفت کی تعلیم حاصل کر کے آزادانہ پیشہ اور تجارت اختیار کر سکتے ہیں جس سے ان کو قوم کی ترقی کے لیے آزادانہ طور پر سوچنے کا موقع ملے گا اور آزادی کا جذبہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ مسدس میں صنعت و حرفت کے حصول کے باب میں لکھتے ہیں کہ :

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
صدائیں یہ ہر سمت سے آرہی ہیں کہ راجا کے پرجا تلک سب سکھی ہیں
تسلط ہے ملکوں میں امن و اماں کا
نہیں بند رستہ کسی کارواں کا
نہ بدخواہ ہے دین و ایماں کا کوئی نہ دشمن حدیث اور قرآں کا کوئی
نہ ناقص ہے ملت کے ارکاں کا کوئی نہ مانع شریعت کے فرماں کا کوئی
نمازیں پڑھو بے خطر معبدوں میں
اذانیں دھڑاکے سے دو مسجدوں میں

کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں　　نہیں بند صنعت کی حرفت کی راہیں
جو روشن ہیں تحصیل حکمت کی راہیں　　تو ہموار ہیں کسب و دولت کی راہیں
نہ گھر میں غنیم اور دشمن کا کھٹکا
نہ باہر ہے فزاق و رہزن کا کھٹکا

انگریزی حکومت کے قیام عمل سے تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی ترقیاں ہوئیں جس کی وجہ سے نئے تصورات جمہوری نظریات اور آزادی رائے وغیرہ وجود میں آئیں ساتھ ہی ترقی اور دریافتوں کی وجہ سے رسل ورسائل کے مسائل حل ہو گئے۔ حالی کا خیال تھا کہ مسلمان ان چیزوں سے فائدہ اٹھائیں اور ترقی کے راستہ پر قدم سے قدم ملا کر چلیں۔ حالی انہیں برکتوں کا ذکر اپنے مسدس میں کرتے ہیں :

مہینوں کے کٹتے ہیں رستے پلوں میں　　گھروں سے سوا چین ہے منزلوں میں
ہر اک گوشہ گلزار ہے جنگلوں میں　　شب و روز ہے ایمنی قافلوں میں
سفر جو کبھی تھا نمونہ سقر کا
وسیلہ وہ اب ہے سراسر ظفر کا
پہنچتی ہیں ملکوں سے دم دم کی خبریں　　چلی آئی ہیں شادی و غم کی خبریں
عیاں ہیں ہر اک برّ اعظم کی خبریں　　کھلی ہیں زمانہ پہ عالم کی خبریں
نہیں واقعہ کوئی پنہاں کہیں کا
ہے آئینہ احوال روئے زمیں کا
کرو قدر اس امن و آزادگی کی　　کہ ہے صاف ہر سمت راہ ترقی
ہر اک راہ رو کا زمانہ ہے ساتھی　　یہ ہر سو سے آواز پیہم ہے آتی
کہ دشمن کا کھٹکا نہ رہزن کا ڈر ہے
نکل جاؤ رستہ ابھی بے خطر ہے

سر سید ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں مسلمانوں کی بربادی کے وجوہ دریافت کرتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں کو حالات و مصلحت کے تقاضوں کے مطابق انگریزوں کی حمایت کرنا چاہئے اور انگریزوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ مسلمان انگریزوں کے بد خواہ نہیں بلکہ خیر خواہ ہیں اگر ان کی پس ماندگی پر توجہ دی جائے اور ان کی ترقی کے لیے کام

کیا جائے تو یہ انگریزی حکومت کو مستحکم کرنے میں معاون ہوں گے۔ اس طرح سر سید نے مسلمانوں اور حکومت کے درمیان مذہبی اور تہذیبی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی اور ان کے مابین باہمی اتحاد و اتفاق کا جذبہ پیدا کیا۔ سر سید نے چونکہ یہ محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں میں پسماندگی کی بنیادی وجہ جدید علوم و فنون سے ان کی بے گانگی اور مغربی تہذیب کی جانب ان کا متعصّبانہ رویہ ہے۔ انہوں نے تعصب سے دور رہنے کی دعوت دی وہ تحریر کرتے ہیں :

"تعصب انسان کو ہزار طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھتا ہے۔ مگر صرف تعصب سے اس کو اختیار نہیں کرتا اور دیدہ و دانستہ برائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے۔" (۱۰)

حالی نے بھی یہ محسوس کر لیا کہ مسلمانوں کی ترقی میں تعصب مانع ہے۔ اس لیے تعصب جیسی بری خصلت سے مسلمانوں کو دور رکھنا ضروری سمجھا تا کہ وہ ترقی کر سکیں۔ مسدس میں تعصب کے بابت یہ اسلامی نظریہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

ڈرایا تعصب سے ان کو یہ کہہ کر — کہ زندہ رہا اور مرا جو اسی پر
ہوا وہ ہماری جماعت سے باہر — وہ ساتھی ہمارا نہ ہم اسی کے یاور
نہیں حق سے کچھ اسی محبت کو بہرا
کہ جو تم کو اندھا کرے اور بہرا

تعصب کہ ہے دشمن نوع انساں — بھرے گھر کئے سیکڑوں جس نے ویراں
ہوئی بزم نمرود جس سے پریشاں — کیا جس نے فرعوں کو نذر طوفاں
گیا جوش میں بولہب جس سے کھویا
ابوجہل کا جس نے بیڑا ڈبویا

سر سید نے برطانوی حکومت کو مسلمانوں کے لیے درست ٹھہرایا اور قرآنی آیات کی روشنی میں انگریزی حکمرانوں کو مسلمانوں کا دوست ٹھہرایا اور مسلمانوں سے کہا کہ وہ انگریزوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کریں اور ان کی حکومت کے لیے استقلال و استحکام کے لیے ایسی کوشش کریں کہ حکومت کی باگ ڈور ہندوؤں کے ہاتھ میں نہ جا سکے۔

حالی چونکہ مسلمانوں کی ترقی کے خواہش مند تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ برطانوی حکومت میں رعایا کو جو آزادی نصیب ہوئی ہے۔ اس کو غنیمت سمجھنا چاہئے اور معاشرتی اور اصلاحی ترقی کے لیے تیار رہنا

چاہئے۔ چونکہ دوسرے لوگ اس کا فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ترقی کر رہے ہیں اگر مسلمان اس سے فائدہ نہیں اٹھائے گا تو وہ بہت پیچھے رہ جائیں گے اور دوسری قوم ان پر ہمیشہ غالب رہے گی۔ مسدس میں دیگر اقوام کا یوں نقشہ کھینچا ہے :

یہاں اور ہیں جتنی قومیں گرامی　　خود اقبال ہے آج ان کا سلامی
تجارت میں ممتاز دولت میں نامی　　زمانہ کے ساتھی ترقی کے حامی
نہ فارغ ہیں اولاد کی تربیت سے
نہ بے فکر ہیں قوم کی تقویت سے

دکاں ان کی ہے اور بازار ان کا　　بچ ان کا ہے اور بہوار ان کا
زمانہ میں پھیلا ہے بیوپار ان کا　　ہے پیرو و جواں برسرکار ان کا
مدار اہلکاری کا ہے اب انہیں پر
انہیں کے ہیں آفس انہیں کے ہیں دفتر

معزز ہیں ہر ایک دربار میں وہ　　گرامی ہیں ہر ایک سرکار میں وہ
نہ رسوا ہیں عادات و اطوار میں وہ　　نہ بدنام گفتار و کردار میں وہ
نہ پیشہ سے حرفہ سے انکار ان کو
نہ محنت مشقت سے کچھ عار ان کو

اس طرح ہم وطن قوموں کے حوالے سے مسلمانوں کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ دیگر اقوام کی ترقی کی رفتار تیز تر ہوتی جارہی ہے اور مسلمان ان کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں اس لیے وہ اس بات زور دیتے ہیں کہ اگر اس قوم نے اپنی خبر نہیں لی تو اس کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا۔

مجھے ڈر ہے اے میرے ہم قوم یارو　　مبادا کہ وہ ننگ عالم تمہیں ہو
گر اسلام کی کچھ حمیت ہے تم کو　　تو جلدی سے اٹھو اور اپنی خبر لو
وگرنہ یہ قول آئے گا راست تم پر
کہ "ہونے سے ان کا نہ ہونا ہے بہتر"

حالی غیر قوموں کی ترقی دیکھ کر اور مسلمانوں کی پستی دیکھ کر بہت متفکر ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنی قوم کو تمام تصادم اور تضاد سے اوپر اٹھا کر انگریزوں کی وفاداری کے ساتھ ترقی میں جٹ جانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس لیے

مسلمانوں کو سوئے ظن سے نکال کر حسن ظن کی طرف لاتے ہیں اور یہ یقین دلاتے ہیں کہ انگریز تمہارے بد خواہ نہیں ہیں :

نہ بد خواہ ہے دین وایماں کا کوئی　　نہ دشمن حدیث اور قرآں کا کوئی
نہ ناقص ہے ملت کے ارکاں کا کوئی　　نہ مانع شریعت کے فرماں کا کوئی
نمازیں پڑھو بے خطر معبدوں میں
اذانیں دھڑاکے سے دو مسجدوں میں

حالی ہندو مسلم کے مابین تفریق کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ ان کا نظریہ یہ تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان باہمی نفاق ہی ہندوستان کی غلامی اور بربادی کا اصل محرک ہے۔

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر　　نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو　　سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی　　اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ہند میں اتفاق ہوتا اگر　　کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر

اسی نظریہ کے تحت حالی نے ملک کی ترقی کے لیے اتحاد و اتفاق کا راستہ اختیار کرنا ضروری سمجھا۔ ان کی یہ بھی کوشش تھی کہ امیر و غریب میں اتنا فرق نہ رہے کہ دونوں دو کناروں پر کھڑے ہو جائیں بلکہ ان میں امداد باہمی اور تعاون کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مسدس میں بیان کرتے ہیں :

غریبوں کو محنت کی رغبت دلائی　　کہ بازو سے اپنے کرو تم کمائی
خبر تاکہ لو اس سے اپنی پرائی　　نہ کرنی پڑے تم کو دردر گدائی
طلب سے ہے دنیا کی گریاں یہ فرصت
تو چمکو گے واں ماہ کامل کی صورت

امیرو کو تنبیہ کی اس طرح پر　　کہ ہیں تم میں جو اغنیاء اور توانگر
اگر اپنے طبقے میں ہوں سب سے بہتر　　بنی نوع کے ہوں مددگار و یاور
نہ کرتے ہوں بے مشورت کام ہرگز
اٹھاتے نہ ہوں بے دھڑک گام ہرگز

حالی کے خیال میں ایک زبان، ایک مذہب، ایک نسل اور ایک قوم کے لوازم ہیں۔ اس لیے وہ ہندوستان کو ایک قوم نہیں گردانتے ہیں ان کا یہ ماننا تھا کہ وہی ملک ایک قوم کے لوگوں کا ملک کہلانے کا مستحق ہے جس کی زبان ایک ہو جس کا مذہب ایک ہو جہاں کے باشندوں کا تعلق بھی ایک ہی نسل سے ہو۔ اس لیے حالی قوموں اور گروہوں کے تصادم سے اوپر اٹھ کر وطن کے مفاد پر زور دیتے ہیں۔ حالی کو یہ خدشہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کی کشیدگی اور فرقہ پرستی کی وجہ سے ترقی کا انسداد نہ ہو جائے۔ اس لیے وہ ان لوگوں کے نظریات سے اتفاق نہیں رکھتے جن کا خیال یہ تھا کہ ہندو مسلم دو جداگانہ قومیں ہیں اور ان میں اتحاد نہیں ہو سکتا اس لیے حالی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ :

> "اس سے زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہو سکتا کہ ہندو اور مسلمانوں میں دوستی اور یکجہتی کے روابط مستحکم نہیں ہو سکتے۔ بے شک بد قسمتی سے ایسے چند ناشدنی اسباب پیدا ہوں گئے ہیں جن سے بالفصل دونوں قوموں کی ایک محدود جماعت کے دل ایک دوسرے سے پھٹ گئے ہیں لیکن ہمارے پاس اس امر کے باور کرنے کے وجوہات موجود ہیں کہ جس قدر ملک میں تعلیم کی ترقی ہوتی جائے گی جس قدر لوگ قومی ضرورتوں سے واقف ہوتے جائیں گے اور جس قدر نااتفاقی کے مضر نتائج تم لوگوں پر آشکارا ہوتے جائیں گے، اسی قدر ان پر یہ راز ظاہر ہوتا جائے گا کہ بغیر اتحاد و یکجہتی کے دونوں قوموں کا ملک میں عزت سے رہنا اور گورنمنٹ کی نظر میں وقعت و توقیر پیدا کرنا غیر ممکن ہے۔ (۱۱)

مسدس حالی کا فنی پہلو

ادب کا اصل مقصد ہے خیالات، جذبات اور احساسات کا اظہار کرنا اور اظہار کے لیے قوتِ احساس کی ضرورت پڑتی ہے جو تخلیق کار کو حرکت میں لاتی ہے۔ قوت اختراع خیال اظہار میں معاون ہوتے ہیں اور اظہار کے لیے جو صورت اختیار کی جاتی ہے اسے ہیئت کہتے ہیں۔ چونکہ اظہار کے لیے ادب میں زبان کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے زبان اس میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے جو دوسرے فنون سے امتیاز پیدا کرتی ہے۔ شاعری میں بات پر اثر ہوتی ہے اور رمز و ایماء کے ذریعے بات کہی جاتی ہے۔ جو نثر میں ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نثر کے مقابل شاعری کی روایت زیادہ مقبول رہی ہے۔

حالی سے قبل اردو شاعری میں جو رجحانات ملتے ہیں وہ اصلاً مسرت و حظ کے سامان بہم پہچانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی حالی سے پہلے شاعری کو صرف مسرت و انبساط کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا یا زمانے کے حقائق کو ذاتی محسوسات تک محدود کر دیا جاتا تھا۔ اس وقت نئے مستقبل کی تلاش یا نئے نقطۂ نظر کی تلاش کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس وقت اپنے کلام کے ذریعے قارئین کو حتی الامکان لطف فراہم کرانا ہی شاعر کا کمال تھا۔ لیکن زندگی ہمیشہ ایک ہی رخ پر گامزن نہیں رہتی بلکہ درپیش مسائل کے ہمدوش اپنا رخ بدلتی رہتی ہے۔ فن کی بھی یہی صورتِ حال ہے جس وقت جاگیر دارانہ نظام تھا۔ تعیش یا مایوسی زندگی کے دو ممکن رخ تھے۔ اس لیے اس وقت کی شاعری میں حرماں نصیبی، غم و اندوہ، کرب و ملال کے جذبات ملتے ہیں یا شاہد و جام، عاشق و معشوق، ساقی و پیمانہ کی باتیں ملتی ہیں لیکن زندگی جب نئے مسائل سے دوچار ہوئی تو شاعری کے پرانے انداز کو چھوڑ کر نیا طرز اختیار کرنا پڑا۔ حالی کی شاعری اسی نئے مسائل کی پیداوار ہے۔

حالی کی شاعری پر غالب اور شیفتہ کی صحبتوں کا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ حالی غالب کے کلام کے مطالب ان سے پوچھتے تھے اور اپنے کلام کی اصلاح بھی کرواتے تھے۔ غالب کا یہ فقرہ کہ :

> ''میں ہر کس و ناکس کو شعر کہنے کا مشورہ کبھی نہیں دیتا لیکن تمہارے بارے میں میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہیں کہو گے تو اپنے ساتھ بڑی بے انصافی کرو گے۔''(۱۲)

یہ حالی کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کافی تھا۔ اب حالی نے شعر و شاعری میں جدت پیدا کرنے کی کوشش تیز کر دی۔ حالی ابتدائی شاعری پر قدماء کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ لیکن ان کی خوبی یہ ہے کہ اس دور میں بھی تصنع اور بناوٹ

سے احتراز کیا۔ اس میں خلوص و دردمندی کو جگہ دی اور سادہ و شائستہ زبان اختیار کی۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں　　شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا(۱۳)

حالی کی عشقیہ شاعری میں بھی شرافت و نجابت کا لحاظ ملتا ہے لیکن یہ رنگ زیادہ دنوں تک حالی کا ساتھ نہیں دے سکا۔ جس رنگ کی تلاش حالی کو تھی وہ رنگ ۱۸۷۴ء میں انجمنِ پنجاب کے جلسے کے بعد انہوں نے اختیار کیا۔ حالی قدیم روش کو چھوڑ کر نئی راہ پر لگ گئے۔ اس لیے بعد کی شاعری میں حالی کا حقیقی رنگ نظر آتا ہے جو خود ساختہ ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں مقصدیت پر خصوصی زور دیا اور اس کا استعمال اصلاحِ قوم کے لیے کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں قوم کی ماضی کی تابناکیوں اور آباء و اجداد کے قابلِ رشک کردار کو پیش کر کے مسلم نوجوانوں کے اندر یقین محکم اور عمل پیہم کا جذبہ بیدار کرنے کی کوشش کی۔ وہ خود اپنی مقصدی شاعری اور نئے طرز پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں :

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی　　بزم شعراء میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا　　ہم نے بھی تیری رام کہانی چھوڑی

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی اقتصادی اور سیاسی صورتِ حال میں زبردست تبدیلی آئی جس کے نتیجے میں آئی تبدیلیوں اور گوناگوں مسائل کو اس دور کی شاعری اپنے تنگ دامن میں سمو لینے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ حالی کی حساس طبیعت نے یہ محسوس کیا کہ دور تنگنائے غزل کے بجائے وسیع داماں صنفِ شاعری کا متقاضی ہے جو حالات کے مد و جزر اپنی پنہائیوں میں جگہ دے سکے و مزید بر آں قوم و ملت کو بھی فائدہ پہنچا سکے۔ ۱۸۷۴ء میں انجمنِ پنجاب کے قیام کے بعد ان کو اپنے خیالات و نظریات کی نشر و اشاعت کرنے کا اچھا موقع ملا۔ اس وقت کے احساسات کو حالی اپنے مسدس کے مقدمہ میں یوں بیان کیا ہے :

> البتہ شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ برسوں دشت جنوں کی وہ خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔ کبھی نالۂ نیم شبی سے ربع مسکوں کو ہلا ڈالا کبھی چشم دریابار سے تمام عالم کو ڈبو دیا۔ آہ و فغاں کے شور سے کروبیوں کے کان بہرے ہو گئے۔ شکایتوں کی بوچھار سے زمانہ چیخ اٹھا طعنوں کی بھرمار سے آسمان چھلنی ہو گیا۔ جب رشک کا تلاطم ہوا تو ساری خدائی کو رقیب سمجھا یہاں تک کہ آپ اپنے سے بدگماں ہو گئے۔ جب شوق کا دریا امڈا تو کشش دل سے جذب مقناطیسی اور قوت کہربا کا کام کیا۔ بارہا تیغ ابرو سے شہید ہوئے اور بارہا ایک ٹھوکر سے جی اٹھے گویا زندگی ایک پیراہن تھا کہ جب چاہا اتار دیا اور جب چاہا پہن لیا۔ میدانِ قیامت میں اکثر گذر ہوا،

بہشت و دوزخ کی بارہا سیر کی بادہ نویسی پر آئے تو خم کے خم لنڈھا دیئے اور پھر بھی سیر نہ ہوئے۔ کبھی خانہ خمار کی چوکھٹ پر جبہ سائی کی کبھی مے فروش کے در پر گدائی کی۔ کفر سے مانوس رہے ایمان سے بیزار رہے پیر مغاکے ہاتھ پر بیعت کی، برہمنوں کے چیلے بنے، بت پوجے، رنار باندھا، قشقہ لگایا زاہدو، پر بھبتیاں کہیں واعظوں کا خاکہ اڑایا دیر اور بت خانہ کی تعظیم کی کعبہ اور مسجد کی توہین کی خدا سے شوخیاں کی، نبیوں سے گستاخیاں کیں۔ اعجاز مسیحی کو ایک کھیل جانا حسنِ یوسفی کو ایک تماشا سمجھا۔ غزل کہی تو پاک شہیدوں کی بولیاں بولیں۔ قصیدہ لکھا تو بھاٹ اور باد خوانوں کے منہ پھیر دیئے۔ ہر مشتِ خاک میں اکسیر اعظم کے خواص بتلائے۔ ہر چوب خشک میں عصاء موسیٰ کے کرشمے دکھائے۔ ہر نمرود وقت کو ابراہیم خلیل سے جا ملایا۔ ہر فرعون بے سامان قادر مطلق سے جا بھڑایا۔ جس کے مداح بنے اسے ایسا بانس پر چڑھایا کہ خود ممدوح کو اپنی تعریف میں کچھ مزا نہ آیا۔ غرض نامۂ اعمال ایسا یاسہ کیا کہ کہیں سفیدی باقی نہ چھوڑی۔(۱۴)

جب حالی کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی اور ان کا یقین بڑھ گیا کہ شاعری کو سماجی افادیت اور قومی اصلاح کے لیے بھی استعمال کیا جانا چاہئے تو اس غرض کی تکمیل کے لیے انہوں نے ایک دیوان مرتب کیا اور اس دیوان میں نئے اور پرانے طرز کے متعلق ایک طویل مقدمہ بھی پیش کیا۔ جس میں شاعری کے حسن و قبح اور مقصد و افادیت پر طویل بحث کی۔ بقول رشید حسن خاں :

"پوری ایمانداری کے ساتھ وہ اس بات کو مان چکے تھے کہ شاعری کا اصل مقصد قومی اصلاح ہونا چاہئے۔ جو شاعری سماجی افادیت کے کام نہیں آسکتی وہ قابل التفات نہیں۔ یہ انداز نظر کی تبدیلی تھی، جس نے بالآخر عقیدے کی شکل اختیار کر لی۔ انہوں نے عالم باعمل کی طرح اسی اندازِ نظر کے تحت بہت کچھ کہا گویا ایسی شاعری کے نمونے بھی پیش کر دیئے اور اس اندازِ شاعری کو برحق ثابت کرنے کی خاطر "مقدمہ شعر و شاعری" میں طویل بحث کیں۔"(۱۵)

حالی شعر و شاعری کو صرف تعریف و تحسین کا ذریعہ ہی نہیں بنانا چاہتے ہیں بلکہ وہ شعر و شاعری کے ذریعہ قاری کو مسحور کر کے اپنا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے وہ ایسا انداز بیان اختیار کرتے ہیں جس سے ہر کس و ناکس باآسانی سمجھ سکے اور غور کر سکے باوجود اس کے وہ فنی کمال کو ہاتھ سے جانے بھی نہیں دیتے ہیں۔ اور ایسا کلام تخلیق کرتے ہیں جو دل و دماغ کو ایک ساتھ متاثر کر دے۔

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں   پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو

حالی یہ محسوس کر چکے تھے کہ حقیقت کی فتح ضرور ہو گی اور جھوٹ کا منہ کالا ہو گا۔ اس لیے پہلے ہی اس کی

طرف متوجہ ہوئے اور بانگ درا بلند کی اور چل پڑے۔

صنعت پر ہو فریفتہ عالم اگر تمام　　ہاں سادگی سے آئیوں اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں　　تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری　　قبلہ ہو اب ادھر تو کیجئو نماز تو

حالی نے کلاسکی روش کو ترک کر کے نئے عقیدے کے تحت قومی اصلاح کی غرض سے شاعری شروع کی اور عشق و عاشقی کی فضول کہانیوں سے بچ کر قوم و ملت کے درد و غم کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ لیکن قدیم روش کو چھوڑنا اتنا آسان کام نہیں ہے کیونکہ خیال کے بدلنے میں اگرچہ دیر نہیں لگتی لیکن انداز کے بدلنے میں عرصہ لگتا ہے۔ حالی اس چیز کو محسوس کرتے تھے اس لیے اس سے پہلے کہ کوئی تنقید کرے وہ خود اس بات کی وضاحت کرتے ہیں :

"ناظرین کو یہ معلوم رہے کہ جب کسی ملک یا قوم یا شخص کے خیالات بدلتے ہیں تو خیالات کے ساتھ طرز بیان نہیں بدلتی۔ گاڑی کی رفتار میں فرق آجاتا ہے مگر پہیا اور دھرا بدستور باقی رہتا ہے۔ اسلام نے جاہلیت کے خیالات بہت کچھ بدل دیئے تھے۔ مگر اسلوب بیان میں مطلق فرق نہیں آیا جو تشبیہی و استعارے پہلے مدح، ہجا، غزل اور تشبیب میں برتے جاتے وہی اب توحید، مناجات، اخلاق اور موعظت میں استعمال ہونے لگے۔ خاص کر شعر میں اس بات کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ متاخرین قدیم شعراء کے بعض خیالات کی پیروی سے دست بردار ہو جائیں گے۔ مگر ان طریقہ بیان سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔ جس طرح کسی غیر ملک میں نئے وارد ہونے والے سیاح کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ملک میں روشناس ہونے والے اور اہل ملک کے دل میں جگہ کرنے کے لیے اسی زبان میں گفتگو کرنی سیکھے اور اپنی وضع صورت اور لباس کی اجنبیت کو زبان کے اتحاد سے بالکل زائل کر دے۔ اسی طرح نئے خیالات کے شاعر کو بھی سخت ضرورت ہے کہ طرز بیان میں قدما کی طرز بیان سے بہت دور نہ جا پڑے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو انہیں پیرایوں میں ادا کرے جن سے لوگوں کے کان مانوس ہوں اور قدما کا دل سے شکر گزار ہو جو اس کے لیے ایسے منجھے ہوئے الفاظ و محاورات و تشبیہات و استعارات وغیرہ کا ذخیرہ چھوڑ گئے۔" (۱۶)

حالی کے ابتدائے شاعری کے زمانے میں غالب، ذوق، مومن اور شیفتہ مقبول خاص و عام تھے۔ غالب میں تفکر اور تجربہ زیادہ تھا اور مومن و شیفتہ عشقیہ شاعری میں کمال رکھتے تھے۔ حالی کی شاعری میں دونوں کا رنگ ملتا ہے۔ یعنی متانت غالب کی اور تعشق مومن کا لیکن حالی مبتذل اور رکیک شاعری سے ہمیشہ دور رہے اور اپنی فطری متانت و شائستگی کا ثبوت دیتے رہے۔ مثلاً :

ہے یہاں حظ وصل سے محروم　　جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی
خندہ گل سے بے بقاتر ہے　　شان ہو جس میں دلربائی کی
جنس کا سے ناروا تر ہے　　خوبیاں ہو جس میں ہوں خدائی کی (۱۷)

حالی کے نئے اور پرانے طرز بیان میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ لیکن خیال اور معنی میں کافی فرق ہے۔ مثال کے طور پر قدیم طرز بیان اور جدید طرز بیان کے چند اشعار پیش خدمت ہیں :

قدیم طرز کے اشعار

عہد وصال دل نے بھلایا نہیں ہنوز　　عالم مری نظر میں سمایا نہیں ہنوز
پیغام دوست کا کوئی لایا نہیں ہنوز　　جھونکا نسیم سحر کا ایا نہیں ہنوز
لگ جائے دل نہ منزلِ مقصود میں کہیں　　ہم جس کو ڈھونڈتے ہیں وہ پایا نہیں ہنوز

جدید طرز کے اشعار

جیتے جی موت کے تم منھ میں نہ جانا ہرگز　　دوستوں دل نہ لگانہ نہ لگانہ ہرگز
عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازوں کی　　دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز
زال کی پہلی رستم کو نصیحت یہ تھی　　کسی دلالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

شاعر مدھم لہجے میں اور پر اثر طریقے سے اپنی بات بیان کرتا ہے جس میں لطف بھی ہے اور فکر کو برانگیختہ کر دینے کی صلاحیت بھی۔ بقول عبادت بریلوی کہ :

"شاعری کا مقصد حالی نے جذبات کو برانگیختہ کرنا ضروری قرار دیا ہے۔ جذبات کو برانگیختہ کرنے سے ان کا مطلب نبی نوع انسان کے دل میں ایک قسم کی جولانی اور امنگ پیدا کرنا ہے تاکہ ان پر چھائے ہوئے اداسیوں کے بادل چھٹ سکیں۔" (۱۸)

حالی اس نئے اور پرانے طرز بیان کی تعریف کو اپنے مقدمہ میں واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ان کی خدمت میں یہ عرض کیا جاتا ہے کہ بے شک طرز ادا میں ..... بہت کم فرق پائیں گے۔ مگر خیالات میں ذرا بھی غور فرمائیں گے تو ایک دوسرا عالم نظر آئے گا وہ دیکھیں گے کہ محمل نہیں بدلے مگر محمل نشیں بدل گئے ہیں گو پیمانے وہی ہیں مگر شراب اور ہے۔

نئے خیالات سے ایسے خیالات ہرگز مراد نہیں ہیں جس سے کسی ذہن میں نہ گزرے ہوں یا کسی کے ذہن کی ان تک رسائی نہ ہو سکے بلکہ ایسے خیالات مراد ہیں جو شاعر و ناشاعر کے دل میں ہمیشہ گزرتے

ہیں اور ہر وقت ان کے پیش نظر ہیں مگر اس وجہ سے وہ ایسے پامال اور متبذل ہیں کہ ان کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا اور ان کی طرف بہت کم التفات کیا گیا اور پایہ شاعری کو ان سے وراء الورئ سمجھا گیا ہے۔ لیکن فی الحقیقت شاعری کا بھید انہیں متبذل خیالات میں چھپا ہوا تھا جو بہ سبب رعایت ظہور کے لوگوں کی نظر سے مخفی تھا۔

دیکھ اے بلبل ذرا گل بن کو آنکھیں کھول کر
پھول میں اگر آن ہے کانٹے میں بھی ایک شان ہے

حالی شاعری سے ارفع و عظیم کام لینا چاہتے تھے وہ چاہتے تھے کہ شاعری کے ذریعہ ماحول و معاشرے میں اصلاح ہو۔ اس لیے انہوں نے اس طرز ادا کو پسند نہیں کیا۔ جو قومی اصلاح کی راہ میں رکاوٹیں حائل کرے۔ حالی کے پیشِ نظر جو مقاصد تھے اس کے لیے ضروری تھا کہ ایسی شاعری پیش کی جائے جس میں جوش بھی ہو اور جو اصلیت پر مبنی بھی ہو اور ساتھ ہی ساتھ سادگی کا دامن بھی ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ لہذا انہوں نے قدیم طرز کو چھوڑا، نیا طرز اختیار کیا۔ جس میں مذکورہ بالا تینوں خوبیاں موجود تھیں۔ غالب و مومن کا آخری زمانہ تھا جب حالی نے اس انداز میں شعر گوئی شروع کی اور نامانوس آواز کو محسوس کے شعر کے قالب میں ڈھال کر اس طرح پیش کی گویا کوئی میٹھے میٹھے درد کے ساتھ گنگنا رہا ہو۔ لیکن یہ درد وہی محسوس کر سکتا تھا جس کو زخم کا احساس ہو اس لیے حالی نے پہلے زخم سمجھایا بعد میں درد۔

حالی کے کلام کی نمایاں خصوصیات سادگی، شائستگی، جوش، اصلیت اور حقیقت پسندی ہے اور بعد کی شاعری میں افادیت بھی شامل ہے۔ اس لیے حالی نے اس طرح کے کلام کو پیش کرنے سے قبل ایک طویل مقدمہ لکھا جو دیوان کے ساتھ چھپا تھا۔ تاکہ قاری یہ محسوس کرلے کہ درد کیا ہے؟ اور دوا کیا لے رہے ہیں؟ یہی مقدمہ بعد میں جدید تنقید کا سنگ بنیاد تسلیم کیا گیا۔ حالی کی یہ تنقید دو مثلثوں کی اساس پر استوار ہے۔ ایک مثلث کے تین زاویوں میں تخیل، مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ شامل ہیں اور دوسرے مثلث شعر کی داخلی ساخت کے بارے میں ہے۔ جو سادگی، اصلیت اور جوش کے زاویوں پر منحصر ہے۔ (۲۰)

حالی اس تحریک کے نمایاں رکن تھے جس کے علمبردار سر سید تھے جو زندگی کے ہر شعبے میں اصلاح و ترقی چاہتے تھے۔ اس لیے وہ ایسی شاعری کی طرف توجہ دلانا چاہتے تھے جو افادیت و واقعیت پر مبنی ہو۔ حالی اس امر میں سر سید کے ہم خیال تھے کہ مسلمانوں کی بربادی کی دیگر اسباب میں شاعری نے بھی ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اس لیے شاعری جیسی کار آمد چیز کو جو تاثیر سے خالی نہیں ہوتی۔ قوم کے لیے وقف کر دی۔ بقول حالی:

"شعر کی تاثیر سے کون انکار کر سکتا ہے ہے۔ سامعین اکثر ان سے حزن یا نشاط یا جوش یا افسردگی کم یا

زیادہ ضرور پیدا ہوتی ہے اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر اس سے کچھ کام لیا جائے تو وہ کہاں تک فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ بھاپ سے جو حیرت انگیز کرشمے اب ظاہر ہوئے ہیں ان کا سراغ اول اس خفیف حرکت میں لگا تھا جو اکثر پکتی ہانڈی میں پر چینی کو پھاپ کے زور سے ہوا کرتی ہے۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ اس ناچیز گیس میں جرار لشکروں اور زخار دریاؤں کی طاقت چھپی ہوئی ہے۔"(۲۱)

حالی نے اسی اصول کے تحت اپنی شاعری کا تانابانا تیار کیا ہے جس میں جوش، اصلیت اور سادگی کی کار فرمائی ہو۔ مثلاً سادگی کے متعلق ان کی رائے ہے کہ "ہمارے نزدیک کلام کی سادگی کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو اور الفاظ جہاں تک ممکن ہو تحادر اور روز مرہ کی بول چال کے قریب قریب ہوں" (۲۲) اسی طرح اصلیت کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ "اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ مراد نہیں ہے کہ شعر کا مضمون حقیقت نفس الامری پر مبنی ہونا چاہئے بلکہ یہ مراد ہے کہ جس بات پر شعر کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ نفس الامر میں یا لوگوں کے عقیدت میں یا محض شاعر کے عندیہ میں فی الواقع موجود ہے" (۲۳) اور جوش کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ " جوش سے یہ مراد ہے کہ مضمون میں ایسے بے ساختہ الفاظ اور موثر پیرایہ میں بیان کیا جائے جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے اپنے ارادے سے مضمون نہیں باندھا بلکہ خود مضمون نے شاعر کو مجبور کر کے اپنے تئیں اس سے بندھوایا ہے "(۲۴) اور اسی پیش نظر حالی نے شاعری کی ہے شاعری کا مقصد اس وقت کھل کر سامنے آتا ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ " شعر اگرچہ براہ راست علم اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا لیکن از روئے انصاف اس کو علم اخلاق کا نائب مناسب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں اسی بنا پر صوفیائے کرام ایک جلیل القدر سلسلے میں سماع کو جس کا جزو اعظم اور رکن رکین شعر ہے وسیلہ قرب الٰہی اور باعث تصفیہ نفس و تزکیہ باطن مانا گیا ہے۔(۲۵)

غرض کہ حالی کی شاعری پر مقصدیت غالب آگئی لیکن دل کی تازگی اور فرحت ان کے کلام میں گاہے بگاہے ملتی ہے۔ "دوسرے لفظوں میں حالی کے دل پر تو غالب کی حکمرانی ہے جب کہ ان کے دماغ پر سرسید قابض ہیں" (۲۶) گو شاعری کا مقصد حالی کے یہاں جذبات کو برانگیختہ کرنا ہو گیا، مسدس حالی اس بات کا ثبوت ہے جس میں اپنی پر جوش اور دلکش شاعری سے مسلمانوں کو اپنے ماضی سے قوت حاصل کرنے کی راہ دکھائی اور اعلیٰ اقدار کو پھر سے زندہ کرنے کی ترغیب دی۔

حالی کا مسدس ۲۹۷ بند کی ایک طویل نظم ہے جس میں تاریخی حقائق اور قرآنی آیات اور مسلمانوں کے حدوث حالات کا بیان ہے اس نظم کی حیرت انگیزی یہ ہے کہ پوری نظم مبالغہ اور اغلاق سے پاک ہے۔ بلکہ بعض جگہ یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ والہانہ محبت میں کہیں کہیں غلو نہ کر جائیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں بھی وہ اپنے انتقادی نظریے پر قائم

رہتے ہیں، یہاں تک کہ امیر المومنین اور رحمت العالمین کے اوصاف بیان کرتے وقت بھی سادگی وراست گوئی سے ذرہ برابر بھی نہیں بھٹکتے ہیں۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا　　وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

اور تعجب یہ ہے کہ تاریخی حقائق کے بیان میں یا اسلام علم کے بیان میں کہیں بھی ثقالت کا گمان نہیں ہوتا۔ مثلا علم کے بیان میں

ابوبکر رازی علی ابن عیسا　　حکیم گرامی حسین ابن سینا
حنین ابن اسحاق قسیّس دانا　　ضیاء ابن بیطار راس الاطبا
انہیں کے ہیں مشرق میں سب نام لیوا
انہیں سے ہوا پار مغرب کا کھیوا

پوری نظم میں ایسی روانی، دلکشی، اور سادگی ہے کہ اس کی کہیں اور مثال ملنا محال ہے۔ اور سادگی بھی ایسی سادگی ہے جو زبان والفاظ سے نہیں بلکہ خلوص، وجدان اور بیچارگی سے پیدا ہوئی ہے اس میں ایسی روانی ہے کہ بڑے بڑے باڑ کو توڑ دیتی ہے۔ اور ایسی دلکشی کہ ہر پڑھنے والا پڑھتا ہے اور اپنے حال زار پر روتا ہے۔ اور یہی حالی کا کمال ہے۔ بقول سر سید کہ جو دل سے بات نکلتی ہے وہ دل میں بیٹھتی ہے۔

مسدس کی دوبڑی خوبی ہے ایک تو یہ کہ یہ نظم حقائق پر مبنی ہے جس میں خلوص، صداقت، اور درد وغم ہے۔ دوسری خوبی اس کی زبان اور بیان میں مضمر ہے۔ جس میں بلا کی سادگی، روانی، شیرینی، دلکشی ہے۔ اس میں زبردست تاثیر بھی ہے اور دلآویز آہنگ بھی۔ تشبیہات واستعارات کا استعمال خال خال دیکھنے کو ملتا ہے۔ لیکن صنائع وبدائع کا التزام خاص ہے۔ بقول عبدالحق کہ زبان کی حقیقی فصاحت دیکھنی ہو تو اس نظم (مسدس) میں دیکھنی چاہئے جس میں مختلف قسم کے مضامین وواقعات نہایت بے تکلفی اور روانی سے ادا کئے گئے ہیں۔ اس بیان کا تسلسل اور مضامین کی بلندی، قابل دید ہے۔ نظم میں الفاظ کا صحیح استعمال جس طرح مولانا نے کیا ہے اور زبان کو اخلاقی اور حکیمانہ خیالات ادا کرنے کے لئے جس طرح کام میں لائے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے۔ بہت سے الفاظ جو دریائے فصاحت میں پار نہیں پا سکتے تھے۔ اور جن

کے جوہر ہم پر اب تک نہیں کھلے تھے مولانا نے ان کی قدر کی اور انہیں ایسے ٹھکانے بیٹھایا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے ان کے ہاتھوں میں معمولی اور سادہ الفاظ جادو سا پیدا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حالی نے زبان کو وسعت نہیں دی بلکہ ایک نئی زبان پیدا کی"(۲۷)

اس طویل نظم میں جوش کی فراوانی، اور بیان کی روانی اس قدر ہے کہ قاری مسحور ہو جاتا ہے۔ تسلسل اور ربط اس میں غایت درجہ موجود ہے پوری نظم میں بھرتی کا ایک شعر بھی نظر نہیں آتا۔ اور صداقت اس قدر ہے کہ اگر حقیقت نگاری کی بنیاد کہی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

اس نظم میں عرب قوم کی اسلام سے قبل دور جہالت کے حالات اور مروجہ رسوم و روایات کو بہت ہی دلکش اور موثر پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اقوام عرب میں پیدا شدہ حیرت انگیز تبدیلی کا ذکر بہت قرینے سے کیا ہے جس نے ان کی سماجی، سیاسی، معاشی اخلاقی اور ذہنی سطح کو بہت ہی قلیل مدت میں اس بلندی پر پہنچا دیا جس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ اس حیرت انگریز تبدیلی کا واحد سبب نزول قرآن (نسخہ کیمیا) تھا جس نے زمانے کے رخ کو پھیر دیا تھا۔ لہذا یوں سخن طراز ہوتے ہیں :

خطا کار سے در گذر کرنے والا　　بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا　　قبائل کا شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

جب یہ نظم ۱۸۷۹ میں چھپ کر آئی تو حالی نے اس نظم کی ایک کاپی سر سید کی خدمت میں پیش کی پڑھنے کے بعد سر سید پر جو تاثر قائم ہوا ان کے خط سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے، ملاحظہ ہو۔

"جناب مخدوم و مکرم من! عنایت نامجات مع پانچ جلد مسدس پہنچے، جس وقت ہاتھ میں آئی، جب تک ختم نہ ہوئی، ہاتھ سے نہ چھوٹی، اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی، اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی، خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے بیان سے باہر ہے تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغے، جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے جو مایہ ناز شعر و شاعری ہے بالکل مبرا ہے۔ کیوں کہ ایسی خوبی اور جوش بیانی، اور موثر طریقے پر ادا ہوتا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے حق ہے جو بات دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔۔۔۔ اگر پرانی شاعری کی بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف ان ہی

الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے۔ بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا؟ تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں اور کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔ میں دل سے شکر کرتا ہوں مگر نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئنہ اور یا ان کے ماتم کا مرثیہ ہے کسی قید سے مقید کیا جاوے"(۲۸)

آخر میں میں یہی کہوں گا کہ مسدس حالی جس کے پہلے اڈیشن کو چھپے ہوئے سو سال سے زیادہ ہو گئے لیکن آج بھی اس کی مقبولیت میں ذرا برابر بھی کمی نہیں آئی اس وقت کے حالات کو سمجھنے کے لئے جہاں تاریخی کتابوں کی ورق گردانی ضروری ہے مسدس پر بھی ایک نظر ڈالی جانی چاہئے۔ کیوں کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ اس میں اس وقت کی زندگی کی تصویر بہت خوبصورت لیکن صداقت کے ساتھ دکھائی دے گی یہی وجہ ہے کہ اس کے تتبع میں بہت سی نظمیں لکھی گئیں "بھارت درپن" اور "اور بھارت بھارتی" اسی کی تقلید میں لکھی گئی ہیں لیکن جو افتخار مسدس کو ہے وہ ان کو نصیب نہیں ہو سکا۔

حواشی و حوالہ جات

۱.	مسدس حالی		ص: ۱۴
۲.	Hali's Poetry A Study	M.Tahir	ص: ۵۵
۳.	یادگار حالی	صالحہ عابد حسین	ص: ۱۷۰
۴.	مسدس حالی کا دیباچہ		ص: ۱۴
۵.	مسدس حالی کا دوسرا دیباچہ		ص: ۷۶
۶.	مسدس حالی کا دوسرا دیباچہ		ص: ۷۶
۷.	یادگار حالی	صالحہ عابد حسین	ص: ۱۵۹
۸.	اردو دانش وروں کے سیاسی میلانات نو آبادیاتی ہندوستان ۱۹۱۴ء - ۱۸۵۷ء	مظہر مہدی	ص: ۵۵-۵۴
۹.	الحقوق والفرائض	نذیر احمد	
۱۰.	مضامین سر سید		ص: ۵۰
۱۱.	مکاتیب حالی		ص: ۵۴
۱۲.	حالی	مالک رام	ص: ۱۸
۱۳.	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	ڈاکٹر سلیم اختر	ص: ۱۹۶
۱۴.	مسدس حالی		ص: ۱۱
۱۵.	دیوانِ حالی	مرتبہ رشید حسن خاں	ص: ۲
۱۶.	دیوان حالی	حالی	ص: ۷
۱۷.	دیوانِ حالی	مرتبہ رشید حسن خاں	ص: ۱۵۷
۱۸.	اردو تنقید کا ارتقاء	عبادت بریلوی	ص: ۱۵۴

۱۹.	دیوانِ حالی (مقدمہ)	حالی	ص: ۸
۲۰.	ادیب تنقید نمبر		ص: ۱۷۰
۲۱.	مقدمہ شعروشاعری	حالی	ص: ۸۳
۲۲.	مقدمہ شعروشاعری	حالی	ص: ۱۳۰
۲۳.	مقدمہ شعروشاعری	حالی	ص: ۱۳۱
۲۴.	مقدمہ شعروشاعری	حالی	ص: ۱۳۴
۲۵.	مقدمہ شعروشاعری	حالی	ص: ۹۳
۲۶.	ادیب تنقید نمبر		ص: ۱۴۹
۲۷.	یادگارِ حالی	صالحہ عابد حسین	ص: ۱۶۰
۲۸.	حالی	مالک رام	ص: ۶۸

کتابیات

۱. اندازے — فراق گورکھپوری — ادارہ انیس اردو، الہ آباد — ۱۹۵۹ء

۲. اردو دانش وروں کے سیاسی میلانات (نو آبادیاتی ہندوستان ۱۹۱۴ء۔ ۱۸۵۷ء)
مظہر مہدی — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس — ۱۹۹۹ء

۳. اردو تنقید کا ارتقاء — عبادت بریلوی

۴. اردو تنقید حالی سے کلیم تک — سید محمد نواب کریم — تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی — ۱۹۹۳ء

۵. الحقوق والفرائض — نذیر احمد — دہلی — ۱۹۲۳ء

۶. انقلاب ۱۸۵۷ء — پی سی جوشی — ترقی اردو بیورو، نئی دہلی — ۱۹۸۳ء

۷. اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ — محمد حسن — قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی — ۱۹۹۸ء

۸. اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ — ڈاکٹر سلیم اختر — عاکف بک ڈپو — ۱۹۹۴ء

۹. اردو زبان اور ادب — حلقہ مصنفین
(شفیق الزماں، ظفر احمد، احمد عثمانی، پرویز شاہد مسلم اسٹوڈینٹس ایسوسی ایشن آف انڈیا، پٹنہ) — ۱۹۸۴ء

۱۰. انتخاب مضامین سرسید — مرتبہ عتیق احمد صدیقی — یوپی اردو اکیڈمی، لکھنؤ — ۱۹۹۳ء

۱۱. تاریخ تحریک آزادی ہند — ڈاکٹر تاراچند
(مترجم قاضی محمد عدیل عباسی) — قومی کونسل برائے اردو زبان، نئی دہلی — ۱۹۹۸ء

۱۲. تاریخ فلسفہ اسلام — ت، ج دوبوئر
(مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین) — ترقی اردو بیورو، نئی دہلی — ۱۹۸۴ء

۱۳. تاریخ دعوت و عزیمت (حصہ چہارم) — ابوالحسن علی ندویؒ — لکھنؤ

۱۴. تاریخ تحریک آزادی ہند — ڈاکٹر تاراچند
(مترجم عدیل عباسی) — ترقی اردو بیورو، نئی دہلی — ۱۹۸۵ء

۱۵. تنقیدی اشارے — آل احمد سرور

۱۶.	حیاتِ جاوید	حالی الطاف حسین	ترقی اردو بیورو	۱۹۹۰ء
۱۷.	حالی ہندوستانی ادب کے معمار	مالک رام (مترجم ایم حبیب خاں)	ساہتہ اکادمی	۱۹۹۵ء
۱۸.	حالی کا سیاسی شعور	معین احسن		
۱۹.	حالی محبِ وطن	ڈاکٹر ذاکر حسین	جمال پریس، دہلی	۱۹۴۳ء
۲۰.	جدید اردو تنقید اصول و نظریات	ڈاکٹر شارب ردولوی	اتر پردیش اردو اکادمی	۱۹۹۴ء
۲۱.	درس بلاغت	قومی کونسل برائے فروغ اردو زباں، نئی دہلی		۱۹۹۷ء
۲۲.	دیوان حالی	مولانا الطاف حسین حالی		
	(مقدمہ رشید حسن خاں)	اردو اکادمی	۱۹۸۷ء	
۲۳.	دیوان حالی	الطاف حسین حالی	یونین پریس دہلی	۱۹۴۴ء
۲۴.	داستان غدر	ظہیر دہلوی لاہور		
۲۵.	سر سید احمد خاں اور ان کا عہد	ثریا حسین	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۳ء
۲۶.	سر سید اور ان کے نامور رفقاء	سید عبداللہ	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۴ء
۲۷.	سید احمد خاں کا سفر نامہ پنجاب	سید اقبال علی	انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ	۱۹۸۴ء
۲۸.	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سیاسی مکتوبات	خلیق احمد نظامی (مرتبہ)	علی گڑھ	
۲۹.	شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک	عبید اللہ سندھی	لاہور	۱۹۴۵ء
۳۰.	شعر العجم ۱۹۰۴ء	مولانا شبلی نعمانی	مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ	۱۹۸۸ء
۳۱.	شبلی ہندوستانی ادب کا معمار	ظفر احمد صدیقی	ساہتیہ اکادمی	۱۹۹۳ء
۳۲.	مکتوباتِ سر سید	مرتبہ مشتاق حسین	علی گڑھ فرنڈس بکڈپو	۱۹۶۰ء
۳۳.	مختصر تاریخ اسلام	مولانا غلام رسول مہر	تاج کمپنی، دہلی	۱۹۹۳ء
۳۴.	مقدمہ شعر و شاعری	خواجہ الطاف حسین حالی		
		(مرتبہ ڈاکٹر وجیہ قریشی)	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۴ء
۳۵.	مقالات حالی		جامعہ پریس دہلی	۱۹۳۴ء
۳۶.	مسدس حالی (مدوجزر اسلام)	مولانا حالی	رام کمار پریس بک ڈپو لکھنؤ	
۳۷.	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ	ثروت صولت	مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی	۱۹۹۲ء
۳۸.	مضامین جمال الدین افغانی	جمال الدین افغانی (مترجم عبدالقدوس قاسمی)	لاہور	
۳۹.	مسلمانوں کا روشن مستقبل	سید طفیل احمد منگلوری	دہلی	۱۹۴۵ء

۴۰. ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک مسعود عالم ندوی حیدر آباد ۱۹۴۶ء

۴۱. ہندوستان کے سیاسیات اسلامی نقطہ نظر سے اعجاز حسین سید حیدر آباد دکن ۱۹۲۵ء

۴۲. نئے اور پرانے چراغ آل احمد سرور لکھنؤ ۱۹۴۶ء

۴۳. یادگار حالی (تذکرہ خواجہ الطاف حسین حالی) صالحہ عابد حسین انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی۔ ۱۹۸۶ء

۴۴. یادگار غالب شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی ۱۹۸۷ء

رسائل

۱. ادیب (سہ ماہی) مدیر مرزا خلیل احمد بیگ جامعہ اردو، علی گڑھ جنوری تا مارچ ۱۹۹۰ء

۲. ادیب (سہ ماہی) مدیر مرزا خلیل احمد بیگ جامعہ اردو، علی گڑھ اپریل تا جون ۱۹۹۱ء

۳. ادیب (سہ ماہی) خصوصی شمارہ اردو تنقید نمبر مدیر مرزا خلیل احمد بیگ
(مرتبہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی) جامعہ اردو، علی گڑھ جنوری تا جون ۱۹۹۳ء

۴. ادیب (سہ ماہی) مدیر مرزا خلیل احمد بیگ جامعہ اردو، علی گڑھ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۷ء

English Version

.1 Eighteen fifty seven Surender nath sen
The Publication Division, Delhi 1985

.2 Hali's Poetry : A Study M. Tahir Jamil (T.H.B.) Bombay 1938

.3 The Indian war of Indipendence V. D. Savakar Bombay 1947

.4 India's Struggle for freedom M. Mukharjee Bombay 1948